***Journal of Religion & Society* (JR&S)**
Available Online:
https://islamicreligious.com/index.php/Journal/index
Print ISSN: 3006-1296Online ISSN: 3006-130X
Platform & Workflow by: Open Journal Systems
https://doi.org/10.5281/zenodo.17417977

Principles and Paradigms of Inter-State Law: A Specialized Study of the Law of War, Human Rights, and Commercial Jurisdictions in the Context of Classical Islamic Texts

Hafiz Amir Shahzad
PhD Scholar-GC University Lahore -Instructor Islamic Studies-Virtual University of Pakistan
hafiz.amirshahzad0300@gmail.com
Muhammad Hammad Saeed
PhD Scholar, Sheikh Zaid Islamic Centre, University of the Punjab Lahore
hammad.res.szic@pu.edu.pk

Abstract
This study offers a focused and comprehensive analysis of the principles and paradigms of inter-state law, particularly on the domains of the law of war (qānūn al-ḥarb), human rights, and commercial jurisdictions, within the hermeneutical framework of classical Islamic texts. Grounded in Qur'anic injunctions, Prophetic traditions (ḥadīth), and the historical practices (sīra) of the early Muslim community, the research examines how traditional jurists conceived interstate relations (siyar), restricted the use of force, and safeguarded individual and collective rights in contexts of conflict and commerce. The study juxtaposes these classical doctrines with modern international legal norms to highlight convergences, divergences, and the interpretive challenges inherent in recontextualizing medieval Islamic legal thought for contemporary global order.

***Keywords**: Islamic international law, classical jurisprudence, law of war (qānūn al-ḥarb), human rights, commercial jurisdiction, siyar, Qur'an and ḥadīth, comparative law.*

ابتدائیہ:

دنیا کے آغاز سے لے کر موجودہ دور تک جنگ کسی نا کسی صورت میں ناگزیر رہی ہے۔قدیم ادوار میں بھی انسانوں کے اختلافات ہوا کرتے تھے اور ان اختلافات میں شدت بعض اوقات جنگ کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔قدیم مذہبی لیٹریچر میں ہمیں جنگ کے اصول و قواعد بھی پڑھنے کو ملتے ہیں۔دنیا کا قدیم مذہبی لیٹریچر ہندوؤں کا ویدک ادب ہے جس میں جنگ کے اخلاقی اصول مذکور ہیں قدیم ادوار میں جب انسانوں نے مل کر رہنا شروع کیا تمدن و تہذیب اپنی ابتدائی شکل میں پنپنے لگے تو انسانوں کے باہم اختلافات بھی وقوع پزیر ہوئے لہذا جہاں تہذیب نے جنم لیا وہیں اخلاقی و مذہبی رواداریوں کو بھی جانا جانے لگا۔جہاں قدیم لیٹریچرز میں جنگوں کے اخلاقی اصول مرتب ہیں وہیں ان مذاہب کے اکابرین ان اصولوں کی پاسداری سے منحرف نظر آئے۔اور معاشرے میں غیر مہذب جنگوں کی وجہ سے بگاڑ پیدا ہونے لگا۔نتیجتاً جنگوں کو فعلِ قبیح سمجھا جانے لگا اگرچہ وہ کسی نیک مقصد ہی کے لئے ہی کیوں نہ وقوع پزیر ہوئیں ہوں۔[1]

[1] محمود احمد غازی، اسلام کا قانون بین المالک (خطباتِ بہاولپور 2)، آٹھواں خطبہ، اسلام کا تصور جنگ اور قانونِ جنگ، شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد، ص:330

مہاتمابدھ کی اخلاقی تعلیمات کے ہم سب خواہاں ہیں باخوبی واقف ہیں بقھ کی تعلیمات میں اخلاقی رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ جنابِ عیسی علیہ السلام کی تعلیمات میں ہمیں یہ اصول بھی ملا کہ اگر تمہارے رخسار پر کوئی ایک تھپڑ مارے تو تم دوسرا بھی اس کے سامنے کردو۔ اس قول سے یہی بات سمجھ آتی ہے عیسی علیہ السلام اپنے پیروکاروں کو اخلاقی تعلیمات سیکھاتے رہے۔ یہاں سوال یہ ہے کہ کیا اگر عیسائیوں کے کسی ایک شہر پر مخالفین نے قبضہ کیا ہو اور عیسائیوں کے جواباً کہا ہو تم ہمارا دوسرا شہر بھی ہتھیا سکتے ہو کیوں کہ ہم جنگ کے حامی نہیں ہیں۔ بدھ کے پیروکاروں کو قتل کیا جائے تو جواباًبدھ ازم کے حامی کہیں ہم اپنے دوسرے افراد بھی قتل کروانے پر راضی ہیں؟ نہیں ہر گز نہیں۔ بلکہ جوابی کاروائی کی جاتی ہے اور بھرپور کی جاتی ہے کیا ہم اٹلی کی تاریخِ قتل وغارت بھول گیئے کس طرح بے رحمی سے انسانیت اور بے گناہ انسانوں کو جنگوں میں قتل کیا گیا۔

ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ کا ایک اقتباس یہود کے قانونِ جنگ کے بارے میں نقل کرنا چاہوں گا:

"یہود کی اگر غیر یہود کے ساتھ جنگ چھڑ جائے اور مخالف قوم جنگ بندی کے لئے ہتھیار ڈال دے، یا امن طلب کرے تو جنگ ایک ہی صورت میں ختم ہو سکتی ہے وہ یہ کہ مخالف قوم کے بالغ مردوں کو قتل کر دیا جائے اور عورتوں بچوں کو غلام بنالیا جائے"[2]

ہم کہ سکتے ہیں حالیہ دنوں غزہ کی ناقابلِ بیان تباہی و فلسطین کی مجموعی صورت حال میں یہود نے جس بے رحمی سے اپنے اسی قانونِ جنگ کی روایت کو زندہ رکھا ہے۔ ایسی روایت کہ جس میں انسانی حقوق کی پاسداری بھی نا کی گئی۔ اسلام کی تعلیمات ایسے غیر انسانی قوانین سے یکسر الگ ہیں۔

لہذا معلوم ہوا دنیائے عالم میں یہ اصول کارفرماں ہے کہ جنگ کوئی بری چیز نہیں ہے لیکن اس وقت تک جب تک اسے اپنے دفاع کی خاطر اور اخلاقی اصولوں کی اتباع میں سرانجام دیا جائے۔ یقیناً جنگ اس وقت برا عمل ہو گا جب یہ کسی قانون ضابطے و اخلاق کے مدار سے یکسر باہر ہو۔[3]

دوسری طرف رسول اللہ ﷺ نے پہلی بار جنگ کے اصولوں کو باضابطہ طور پر نا صرف متعارف کروایا بلکہ خود بھی ان اصولوں پر عمل پیرا رہے۔ اسلام کے حربی لیٹریچر کا مطالعہ کرنے سے کچھ اصول ملتے ہیں جن کو من جملہ نقل کئے دیتا ہوں۔ باقاعدہ جب فوجیں کسی محاذ پر نکل رہیں ہوتیں تو انہیں کہا جاتا، ناحق قتل مت کرنا، دشمن کو دین کی دعوت دینا، اگر مان جائیں تو ان کی جان ومال کی حفاظت کرنا ، دشمن کی املاک کو نقصان مت پہنچانا، فصلیں تباہ مت کرنا، عورتوں بچوں پر ظلم مت کرنا نہ ہی ان کو قتل کرنا، غیر محاربین سے انحراف کرنا، اگر دشمن مسلمانوں کی بالادستی قبول کرلیں جنگ بندی کر دینا۔ جناب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان ہدایات کو مؤثر طریقے سے لکھوا کر فوجوں میں تقسیم کروایا اور پڑھ کر سنانے کی ہدایات بھی جاری کیں۔[4]

سرِ موضوع میں واضح کرتا جاوں کہ قدیم ادوار میں جنگ کسی قاعدے ضابطے کے تحت نہیں لڑی جاتی تھی بلکہ جو جس وقت چاہتا کمزور کو مسل کر ریاست پر قابض ہو جایا کرتا تھا۔ تاریخ قبل از اسلام کا مطالعہ کیجئے معلوم ہو گا ریاستوں کی تشکیل قوموں کی طاقت کے بل

[2] اسلام کا قانون بین الممالک، ص:336

[3] ایضا

[4] اسلام کا قانون بین الممالک، ص:337

بوتے پر ہوا کرتی تھی کہ طاقت کے وار سے کمزور کو کچل دیا جاتا اور ضکومتیں قائم ہو جایا کرتیں تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس بے ھنگم ضابطے کا عملی خاتمہ فرمایا اور متعدد بار یہ الفاظ حدیث لیٹریچر میں پڑھنے کو ملتے ہیں کہ حکمران جیسا بھی ہو جہاد اسی کی نگرانی میں طے پائے گا۔[5] اگر سربراہ ریاست کی اجازت کے بغیر جہاد عوام الناس اپنی مرضی سے شروع کریں گے فساد فی الارض کی متعدد صورتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہی اصول امام ابو یوسفؒ نے نقل فرمایا "لا تسری سریۃ بغیر اذن الامام" امام کی اجازت کے بغیر جہادی دستہ نہ بھیجا جائے۔

اسلام میں جنگ کا مقصد محض طاقت کا حصول یا زمینوں اور وسائل پر قبضہ پانا نہیں بلکہ اس کا جواز اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ظلم و جبر کو ختم کرنا اور مظلوم و مجبورِ محض کی مدد کرنا مقصود ہو۔ اموی خلیفہ جناب عمر بن عبد العزیزؒ نے اپنے ایک گورنر کو، جو نو مسلموں کی وجہ سے خراج کی قلت کی شکایت کر رہا تھا، واضح الفاظ میں لکھا کہ اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو بطور ٹیکس مجتمع نہیں بلکہ راہِ حق کی ہدایت کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے۔ اسلام میں جنگ کا مقصد صرف عدل قائم کرنا اور جارحیت کو روکنا ہے۔ فقہاء نے یہ اصول بیان کیا ہے کہ جنگ کا جواز محض اس وقت ہے جب مسلمانوں پر براہِ راست حملہ کیا جائے یا مسلمانوں کو جبراً عقائدِ ضروریہ سے پھیرنا و ایمان کو زبردستی بدلنے کی کوشش کی جائے۔ قرآنِ کریم میں ارشاد ہے:

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ۔[6]

جن کے خلاف جنگ کی جاتی ہے، انہیں اجازت دی گئی ہے کیونکہ ان پر ظلم ہوا ہے اور بے شک اللہ ان کی مدد پر قادر ہے۔

اسی طرح ایک اور مقام پر فرمایا گیا:

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ [7]

"اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں، لیکن زیادتی نہ کرو، بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

مذکورہ آیت کے مطابق اسلام میں جنگ صرف ظلم کے دفاع اور جارحیت کے مقابلے کے لیے مشروع ہے، نہ کہ دوسروں پر اپنی رائے یا مذہب مسلط کرنے کے لیے۔ اسی بنیاد پر نبی اکرم ﷺ نے عورتوں، بچوں اور عبادت گزاروں کو قتل کرنے سے سختی کے ساتھ منع فرمایا۔ اس سے یہ اصول مرتب ہوا کہ غیر مقاتلین ہر حال میں محفوظ رہیں گے۔

جہاد کے مقاصد میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کمزور اور مظلوم طبقوں کو ظلم سے نجات دلائی جائے، جیسا کہ قرآنِ مجید میں ارشاد ہے:

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ... [8]

---

[5] عن ابي هريرة، قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم:" الجهاد واجب عليكم مع كل امير برا كان او فاجرا، والصلاة واجبة عليكم خلف كل مسلم برا كان او فاجرا، وإن عمل الكبائر والصلاة واجبة على كل مسلم برا كان او فاجرا، وإن عمل الكبائر۔(سنن ابي داود،كتاب الجهاد ،حديث: 2533)

[6] الحج:39

[7] البقرۃ:190

[8] النساء:75

”اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اور ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کے لیے قتال نہیں کرتے جو پکارتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں۔“

فقہائے اسلام نے اس اصول پر بھی بحث کی ہے کہ جنگ کی ابتدا مسلمانوں کی طرف سے نہیں کی جائے گی ۔یورپی مستشرق تھامس آرنلڈ بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ابتدائی اسلامی فتوحات کا مقصد عیسائیوں کو زبردستی مسلمان بنانا نہیں تھا بلکہ سیاسی و سماجی عوامل تھے۔ اس کے برعکس، بعد میں عیسائیوں نے تاثر دینا شروع کیا کہ اسلام تلوار کے ذریعے پھیلایا گیا ہے۔[9] الغرض اسلام میں جنگ کا تصور صرف ایک دفاعی جنگ کا ہے۔ اس کا مقصد ظلم کو روکنا، انسانی اقدار کا تحفظ کرنا اور زمین میں عدل قائم کرنا ہے۔ اسلام نہ صرف جارحیت سے روکتا ہے بلکہ غیر مقاتلین کی حفاظت، معاہدات کی پاسداری اور صلح کی کوشش کو اولین ترجیح دیتا ہے۔

حربی معاہدات کی پاسداری اور اسلامی تعلیمات:

تالیفِ قلبی:

بین الاقوامی تعلقات میں ایک اہم اصول تالیفِ قلب کا ہے۔ قرانِ کریم سورہ توبہ کی آیت 60 کے مطابق تالیفِ قلب کا ثبوت ملتا ہے ۔[10] نومسلم افراد کے معروضی حالات کے تناظر میں انہیں معاشی طور پر مستحکم کرنے کے لئے یہ اصول اسلام نے متعارف کروایا تھا۔ جہاں نو مسلم کی قلبی تالیف مقصود تھی وہیں بین الاقوامی تعلقات کی اہم کڑی بھی ملتی ہے تاکہ نو مسلم آبادی کو قبولتِ اسلام کے بعد مستحکم کیا جائے۔ یہاں تالیفِ قلبی کی متعدد صورتوں کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا۔ عام طور پر ہمارے ہاں تالیفِ قلبی زکاۃ کی رقم نکالنے پر ہی منحصر ہوتی ہے لیکن اگر بنظرِ عمیق دیکھیں تو اس کی اور بھی بہت سی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے نو مسلم آبادیوں میں زکاۃ کی رقم سے مال کی تقسیم کا یہ اصول بڑی دور اندیشی سے لاگو کیا تھا اور پھر اللہ تعالی کی بھی یہی منشاء تھی تاکہ اسلام کو افراد کی کثرت سے قوی بنایا جائے۔ سورۃ توبہ کی آیات نمبر 8 میں "والمؤلفة قلوبھم" کے الفاظ عہدِ نبوی ﷺ میں بذریعہ وحی یا خود آپ ﷺ نے کسی اشارہ کنایہ سے بھی ان کے نسخ پر کبھی دلیل پیش نہیں کی۔ لہذا مذکورہ نص اپنی اصلی حالت میں موجود رہی۔ لیکن ایک روایت جو کہ جناب عمر رضی اللہ عنہ سے منسوب ہے کہ "اب اسلام کو افراد کی ضرورت نہیں بلکہ افراد کو اسلام کی ضرورت ہے لہذا اب کسی نو مسلم کو اس وجہ سے مال دے کر اس کی تالیف قلب کی جائے کہ وہ اسلام پر ہی قائم رہے اور اس کے دل میں مال کی جاہ ہی سہی لیکن وہ اسلام سے روگردانی نا کر جائے روا نہیں ہے "اس قول سے فقہاء نے مسئلہ اخذ کیا کہ اب جب اسلام کو اللہ تعالی نے افراد کی کثرت سے نوازا ہے تالیفِ قلبی کا حکم جناب عمر رضی اللہ عنہ کے اجتہاد و اجماعِ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم سے منسوخ ٹھہرا۔

دوسری طرف اسلامی بین الاقوامی تعلقات کے تناظر میں یہ نص بڑی کارگر ثابت ہوتی ہے۔ ہم عربی ادب میں پڑھتے ہیں "اذا فات الشرط فات المشروط"جب شرط کا وجود ختم ہو جائے تو مشروط بھی ختم ہو جاتا ہے۔ لہذا کہا جا سکتا ہے کہ جناب عمر رضی اللہ عنہ کے دور کے حالات ہر جگہ موجود نہیں ہو سکتے ہیں۔ کئی ممالک میں اسلام کو افراد کی آج بھی ضرورت ہے۔ کیا ایسے حالات میں بھی

---

[9] Th omas Arnold, ad-da’wa ila-l-islam (Th e Islamic Preaching), (Arabic translation), Cairo, 1957, 2nd ed., pp: 47.

[10] اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِى الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِى سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۖ فَرِيضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ

تالیفِ قلب جو کہ نص سے ثابت شدہ حکم ہے اسے اجماع کے تحت غیر عامل ہی مانا جائے گا۔ جبکہ کئی ایسی امثلہ موجود ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ کی سیرت احکام و وقائع سے صراحتاً معلوم ہوتا ہے آپ ﷺ نے مخصوص حالات کے پیشِ نظر غیر مسلم کی دلی تسلین کے لئے مال دیا اور انہیں مستحکم بنایا۔ ایسا کرنا بین الاقوامی تعلقات کی مضبوطی کی دلیل تھا ہم چند امثلہ سے اپنے دعوی پر دلیل پیش کرتے ہیں:

ابویعلی الفراء حنبلی نے الاحکام السلطانیہ میں نقل کیا ہے:

المؤلفہ قلوبھم وھم اربعۃ اصناف: مؤلفۃ قلوب کی چار اصناف ہیں۔

تتالف قلوبھم لمعونۃ المسلمین(ایک قسم ان لوگوں کی جن کے دل مسلمانوں کو مدد دینے کے لئے موہ لئے جاتے ہیں)

تتالف للکف عن المسلمین(ایک قسم ان لوگوں کی جن کو مسلمانوں کو ایذاء دینے سے روکنے کے لئے رقم دی جائے)

تتالف لیرغبھم للاسلام(اسلام کی طرف رغبت دلانے کے لئے)

یتالفھم ترغیباً لقومھم و عشائرھم فی الاسلام ،فیجوز ان یعطی کل واحد من ھذہ الاصناف من سھم المؤلفۃمسلماً کان اور مشرکاً(ایک قسم ان لوگوں کی جن کے خاندانوں کو اسلام کے شعائر کی طرف رغبت دلانے کے لئے تالیف کی جائے)اور جائز ہے مذکورہ تمام اصناف کے لوگوں کو رقم دی جائے اگرچہ وہ مسلمان ہوں یا مشرک۔[11]

ابن رشدؒ کے مطابق امام ابوحنیفہ اور امام شافعیؒ کا بھی یہی نظریہ ہے کہ یہ حکم منسوخ نہیں ہوا بلکہ حاکمِ وقت معروضی حالات کے تناظر میں اس حکم سے مصالح اسلامی کا کام لے سکتا ہے۔[12]

امام سرخسیؒ نے المبسوط میں نقل کیا ہے قبل از فتح مکہ شدید قحط پڑا جس پر رسول اللہ ﷺ نے ابوسفیان کو 500 اشرفیوں کا تھیلا بھیجا کہ مکہ کے غراباء وحاجت مندوں میں تقسیم کی جائیں۔ ابوسفیان نے جھنجھلا کر پوچھا کیا اب محمد مکہ کے غرباء و نوجوانوں کو ہمارے خلاف کرنا چاہتا ہے ؟۔[13] ابوسفیان کی بیٹی امِ حبیبہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ ﷺ کا نکاح کرنا بھی اسی کڑی کا ایک ثبوت ہے کہ مابین دو ریاستوں (میثاقِ مدینہ کے بعد مدینہ ومکہ دو الگ الگ ریاستوں کی شکل اختیار کر گئے) کے سربراہوں میں تعلقات بہتر ہو سکیں۔[14] نو مسلموں کو بڑے بڑے انعام واکرام بھی دئے جاتے تھے انہیں باور کروایا جاتا کہ اخروی وروحانی طور پر ہی نہیں بلکہ مادی اعتبار سے بھی آپ کا نیا دین آپ کے حق میں بہتر ہے۔ بخاری شریف میں روایت ہے:

خیارُکم فی الجاھلیۃِ خِیارُکم فی الاسلامِ اِذَا فَقِھُوا[15]

---

[11] ابویعلی الفراء، الاحکام السلطانیہ، مصر، ص:116 (بحوالہ عہدِ نبوی میں نظامِ حکمرانی، ص:256)

[12] ابن رشد، بدایۃ المجتھد، کتاب الزکاۃ، جملہ خامس، فصل اول، مسئلہ دوم، بحوالہ عہدِ بنوی میں نظامِ حکمرانی:256

[13] المبسوط للسرخسی، ج10، ص:92-95 بحوالہ ڈاکٹر حمید اللہ، عہدِ بنوی کا نظامِ حکمرانی، 257

[14] رسول اللہ ﷺ نے عمرو بن امیہ الضمری کو حبشہ بھیجا انہوں نے ام المومنین حضرت امِ حبیبہ رضی اللہ عنہا کا نکاح آپ ﷺ سے غائبانہ پڑھایا۔ یہ فتح مکہ کا زمانہ تھا اسی کے متعلق یہ آیات بھی نازل ہوئی "عسیٰ اللہ ان یجعل بینکم وبین الذین عادیتم منھم مودۃ" چنانچہ یہ نکاح ابوسفیان کے لئے نرمی ومودت کا سبب بنا۔

[15] مسلم بن حجاج القشیری، الصحیح المسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، حدیث:6454

جو زمانہ جاہلیت میں معزز تھے وہ بعد از قبول اسلام بھی معزز ہی رہیں گے البتہ جب وہ اپنے دین میں پختہ ہو جائیں۔یہی وجہ ہے فتح مکہ کے بعد ابو سفیان و نو مسلموں کو سینکڑوں اونٹ فی کس بطورِ انعام دیئے گئے۔

سفیروں کو انعام و اکرام دینے میں آپ ﷺ اس قدر خُو گر تھے کہ وصال کی وصیتوں میں سے ایک وصیت یہ بھی تھی میرے بعد سفیروں کو انعام و اکرام سے نوازا جائے تا کہ یہ سنت بر قرار رہے۔کیا اس حکم سے بین الاقوامی تعلقات کے استحکام کی دلیل نہیں نکلتی ؟؟اسی طرح شہر طائف کا ایک وفد مدینہ آتا ہے اور ان شرائط پر اسلام قبول کرنے کی حامی بھرتا ہے کہ ہمارے لئے نماز و زکاۃ سے استثناء دیا جائے۔شراب حرام نہ رہے۔زنا حرام نہ رہے۔ہمارے شہر کو مدینہ کی طرح حرم بنایا جائے۔جہاد ان کے لئے فرض نہ رہے ۔رسول اللہ ﷺ نے نماز اور زناء کی شرائط کو رد فرمایا باقی شرائط پر مصلحتی خاموشی فرمائی۔ان کے جانے کے بعد آپ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جہاد اور زکاۃ کی فرضیت منسوخ نہیں ہوئی بلکہ جب اسلام ان کے دلوں میں گھر کر جائے گا وہ یہ امور بھی سر انجام دیں گے۔ لہٰذا معلوم ہوا اگر تالیفِ قلبی اس حد تک برتی جاسکتی ہے تو کیا مادی فوائد کے لئے نہیں عمل لائی جاسکتی ؟

غیر مقاتلین کا تحفظ:

اسلامی قانون بین الاقوام میں غیر متحاربین کے دفاع پر زور دیا گیا ہے۔غیر متحاربین سے مراد وہ افراد ہیں جو جنگ میں باقاعدہ شریک نہ ہوں اگرچہ ان کا تعلق مخالفینِ جنگ سے ہی کیوں نا ہو۔اسلام نے جہاں میدان حرب میں مخالفین سے دفاع کے اصول وضع کئے ہیں وہیں خود مخالفین کے غیر جنگجو افراد کو بھی مکمل تحفظ فراہم کیا گیا ہے۔تاریخِ انسانیت میں یہ پہلی بار ہوا کہ اس حد تک خیال کیا جائے کوئی غیر مضر انسان اگرچہ دشمن کی طرف سے ہی کیوں نا ہو اسے قتل نا کیا جائے۔کتنا مشکل کام ہوتا ہو گا کہ میدان میں فوجیں آمنے سامنے ہوں افراد کی بھرمار ہو اور ان اصولوں کو مدِ نظر رکھا جائے جو رسول اللہ ﷺ نے اپنے فوجی دستوں کی رہنمائی کے لئے کہیں ہوں۔کہاں پہچان ہوتی ہے کون اپنا ہے کون غیر ہے ؟ کہاں تلوار کی گرمی کو اسلامی اصولوں کے سائے سے ٹھنڈا کیا جاسکتا تھا لیکن صحابہ کرام علیہم الرضوان نے کر کے دکھایا۔یہی انسانی حقوق ہیں جو اسلام کی سرشت میں پنپنے سے لے کر امریکہ و یورپ کی اندھی سیاست و خارجہ پالیسی کے اصولوں کو جِلا بخشتے نظر آرہے ہیں۔اس اصول کی بنیاد قرآنِ کریم کی درج ذیل آیت بنتی ہے:

وَ قَاتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ الَّذِیۡنَ یُقَاتِلُوۡنَکُمۡ وَ لَا تَعۡتَدُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الۡمُعۡتَدِیۡنَ[16]

اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں، اور زیادتی نہ کرو، بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

تفسیر مفاتیح الغیب میں امام فخر الدین رازیؒ مذکورہ آیت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"إِنَّمَا يُعَدُّ مِنَ الْمُقَاتِلِينَ مَنْ يُشَارِكُ فِعْلًا فِي الْقِتَالِ، أَمَّا مَنْ لَهُ مُجَرَّدُ رَغْبَةٍ فِي الْحَرْبِ أَوِ اسْتِعْدَادٌ لَهَا فَلَا يُسَمَّى مُقَاتِلًا إِلَّا إِذَا اشْتَرَكَ مُبَاشَرَةً فِي الْمَعْرَكَةِ."

[16] البقرۃ:190

"وہی شخص مقاتلین میں شامل ہو گا جو بالفعل جنگ میں حصہ لے رہا ہے محض جنگ کی خواہش یا تیاری رکھنے والے کو مقاتل نہیں کہا جائے گا الا یہ کہ وہ براہ راست جنگ میں شریک ہو جائے۔"[17]

احادیث مبارکہ میں متعدد مقامات پر مذکور ہے نبی اکرم ﷺ نے غیر جنگجو افراد سے مقاتلہ کرنے سے منع فرمایا ہے حتی کہ اسلامی قانونِ جنگ میں یہ اصول بھی ہے کہ اگر کوئی دشمن جنگ سے دستبردار ہو جائے اور امان طلب کرلے اسے امان دینا بھی ضروری ہے اگرچہ امان طلب کرنے میں کوئی بھی حیلہ استعمال کیا گیا ہو۔[18] نبی اکرم ﷺ کی کثیر احادیث شاہد ہیں کہ جنگ میں عورتوں، بچوں، بوڑھوں، عُصفاء (اجرت پر کام کرنے والے خادم) اور اصحاب الصوامع (راہب یا گوشہ نشین عبادت گزار) کو مت قتل کیا جائے۔[19] لفظ عُصفاء، "عصیف" کی جمع ہے جس کا مطلب ہے اجرتی ملازم یا نوکر۔ جنگ کے سیاق میں اس سے مراد وہ افراد ہیں جو دشمن کی فوج کے لیے اجرت پر خدمات سر انجام دیتے ہوں، مثلاً سامان یا جانوروں کی دیکھ بھال، لیکن چونکہ وہ براہِ راست لڑائی میں شریک نہیں ہوتے اس لیے انہیں مقاتل شمار نہیں کیا جائے گا۔ اس اصول کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ عصرِ حاضر میں بھی طبی عملہ (سویلین وملٹری ڈاکٹرز، نرسز)، جنگی رپورٹرز یا ایسے افراد جو دشمن فوج کو صرف خدمات فراہم کریں لیکن براہِ راست جنگ میں شریک نہ ہوں ان پر حملہ کرنا حرام ہے۔ قطع نظر کہ ان کا تعلق دشمن کی جماعت سے ہے کیونکہ اسلام میں لا ضرر ولا ضرار کی پالیسی کے تحت احکامات لاگو ہوتے ہیں۔

اس اصول کو نبی اکرم ﷺ کی کئی احادیث سے مطابقت ہے، جن میں آپ ﷺ نے فرمایا:

- ✓ لَا تَقْتُلُوا شَيْخًا فَانِيًا، وَلَا صَبِيًّا، وَلَا امْرَأَةً[20]

بوڑھے، بچے اور عورت کو قتل نہ کرو۔

---

[17] رازی، محمد ابن عمر فخر الدین، مفاتیح الغیب، دار لفکر، بیروت، 1981ء، ج5، ص:138

[18] حافظ محمد الطاف، ڈاکٹر حافظ عبد الباسط خان. "حالت امن کے قواعد کلیہ (فقہائے کرام کی آراء کی روشنی میں)." Al-Idah 29, no. 2 (2014): 92-121.

[19] دورانِ جنگ صرف انہی دشمنوں کو قتل کرنے کی اجازت ہے جو عملًا جنگ میں شریک ہوں جبکہ آبادی کا غیر محارب (non-combatant) حصہ جس میں بیمار، معذور، گوشہ نشین افراد، بچے، بوڑھے اور عورتیں شامل ہیں قتال کی اجازت سے مستثنیٰ ہے. فتحِ مکہ کے موقع پر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو ہدایات جاری فرمائیں ان میں مذکور ہے کہ جو مقابلہ نہ کرے، جان بچا کر بھاگ جائے، اپنا دروازہ بند کرلے یا زخمی ہو اس پر حملہ نہ کیا جائے. امام مسلم حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ فتحِ مکہ کے دن حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:**مَنْ دَخَلَ دَارَ اَبِي سُفْيَانَ فَهُوَ آمِنٌ، وَمَنْ اَلْقَى السِّلَاحَ فَهُوَ آمِنٌ، وَمَنْ اَغْلَقَ بَابَهُ فَهُوَ آمِنٌ.** ''جو شخص ابو سفیان کے گھر میں داخل ہو جائے گا اُسے امان ہے، جو شخص ہتھیار پھینک دے اُسے امان ہے اور جو شخص اپنے گھر کے دروازے بند کرلے اُسے بھی امان ہے.'' // قشيری،مسلم بن حجاج، مسلم، الصحيح، كتاب الجهاد والسير، باب فتح مكة، 3: 1407، رقم: 1780 //سليمان بن اشعث ،ابو داؤد، السنن، كتاب الخراج والإمارة والفيء، باب ما جاء في خبر مكة، 3:162، رقم: 3021

[20] احمد عبد الرحمٰن البنّا الساعتی، بدائع المنن فی جمع وترتیب مسند الشافعی والسنن: مذیلۃ بالقول الحسن شرح بدائع المنن، مکتبہ الفرقان، قاہرہ، 1983، طبع ثانی، ج2، ص12۔

- ✓ لَا تَقْتُلُوا الْوِلْدَانَ، وَلَا أَصْحَابَ الصَّوَامِعِ[21]
  بچوں اور راہبوں کو قتل نہ کرو۔
- ✓ لَا تَقْتُلُوا وِلْدَانًا وَلَا عُصَفَاءَ[22]
  بچوں اور اجرتی خادموں کو قتل نہ کرو۔

صحابہ کرامؓ نے بھی نبی اکرم ﷺ کے مذکورہ اصول کی پیروی کی۔ چنانچہ حضرت ابو بکر صدیقؓ (م634ء) اپنی فوج کے کمانڈر کو حکماً کہا کرتے تھے:

"کسی بچے، عورت یا بوڑھے کو قتل نہ کرنا۔ پھل دار درخت نہ کاٹنا، عمارتیں نہ گرانا، بکری یا اونٹ کو ذبح نہ کرنا مگر کھانے کے لیے۔ کھجوروں کے درخت نہ جلانا اور نہ ہی انہیں پانی میں ڈبونا۔ مالِ غنیمت میں خیانت نہ کرنا اور نہ ہی بزدلی دکھانا۔[23]

اسی طرح حضرت عمر بن خطابؓ نے اپنی فوج کو تحریری ہدایات دیں:

کاشتکاروں کے بارے میں اللہ سے ڈرو، انہیں قتل نہ کرو جب تک وہ خود تمہارے خلاف جنگ نہ کریں۔[24]

غیر جنگجوؤں کے یقینی تحفظ میں فقہاءِ اسلام کی آراء:

اسلامی حربی قانون بین الاقوام میں غیر مقاتلین کے تحفظ کا اصول بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ فقہاء نے عورتوں، بچوں، بوڑھوں، اندھوں، معذوروں، مجنونوں، کاریگروں اور تاجروں کو قتال سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔[25] یہی اصول جدید بین الاقوامی قانونِ جنگ (Additional Protocol I, Article 48) کے ساتھ ہم آہنگ ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ جنگ میں ہمیشہ عام شہریوں اور فوجیوں کے درمیان فرق رکھا جائے اور حملے صرف فوجی اہداف پر کیے جائیں، نہ کہ عام شہریوں یا ان کے اموال پر۔[26] تاہم فقہاء اس بات پر متفق ہیں "وان قاتلن قتلن " اگر عورت مقاتلہ کرے تو بدلے میں قتل کی جائے گی۔ اگر کوئی غیر جنگجو عملاً جنگ میں

---

[21] صادق بن حسن بن علی الحسینی القنوجی البخاری ابو الطیب، الروضۃ الندیۃ شرح الدرر المنیرۃ، ادارۃ الطباعۃ المنیریۃ، قاہرہ، جلد 2، ص339۔

[22] ایضا

[23] عبد اللہ بن ابی شیبہ، الکتاب المصنف فی الاحادیث والآثار، جلد 6، دار الکتب العلمیہ، بیروت، 1995، ص478۔

[24] احمد بن الحسین بن علی البیہقی، السنن الکبریٰ، دار الکتب العلمیہ، بیروت، 2003، طبع ثانی، جلد 9، ص155۔

[25] وہبہ الزحیلی، موسوعۃ الفقہ الاسلامی والقضایا المعاصرۃ، ، دار الفکر، دمشق، 2010، ج 7، ص511۔
For further information on the principle of distinction between combatants and non-combatants, see Ameur Zemmali, Islam and International Humanitarian Law: Principles on the Conduct of Military Operations, 4th ed., ICRC, 2010, pp. 162–163.

[26] Protocol Additional (I) to the Geneva Conventions of 12 August 1949, 1125 UNTS 3, 8 June 1977 (entered into force 7 December 1978), Art. 48, available at: https://ihl-databases.icrc.org/applic/ihl/ihl.nsf/Treaty.xsp?action=openDocument&documentId=D9E6B6264D7723C3C12563CD002D6CE4.

شریک ہو جائے مثلاً عورت فوج کو اُبھارے، بچہ یا بوڑھا دشمن کی صفوں میں منصوبہ بندی یا جنگی عمل میں حصہ لے تو وہ اس تحفظ سے محروم ہو سکتا ہے۔[27] اس سلسلے میں جزوی فقہی اختلافات موجود ہیں۔

اسلام تو ایسے حربی اصولوں کا قائل ہے کہ حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ جن کو رسول اللہ ﷺ نے اپنی تلوار دی تھی ان کی زد میں غزوہ احد میں ایک عورت آگئی جسے قتل کیا جا سکتا تھا لیکن ابو دجانہ نے رعایت برتی اور کہا یہ تلوار اس شان کی حامل نہیں ہو سکتی کہ اس سے کسی عورت کو قتل کیا جائے۔[28] دوسری طرف حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا کلیجہ بھی ایک عورت کے ایماء پر ہی چبایا گیا اذیت ہوئی لیکن رسول اللہ ﷺ کی شانِ امتیازی تھی آپ نے ہندہ کے قتل کا حکم میدانِ جنگ میں بھی نا دیا بلکہ بعد میں عام معافی کا اعلان کر دیا۔

بین الاقوامی ریاستوں کے وجودی ڈھانچے کو تسلیم کرنا:

اسلام نے بین الاقوامی سطح پر ریاستوں کے وجود اور ان کی خود مختار حثیت کو تسلیم کیا ہے اصولاً کوئی ریاست دوسری ریاست کے معاملات میں مداخلت یا اس کی آزادی کو سلب کرنے کی مجاز نہیں۔[29] ریاستی خود مختاری کو تسلیم نہ کرنا یا اس کے وسائل پر قابض ہونا اسلامی اخلاقی حربی اصولوں کے خلاف اور ظلم کے مترادف ہے۔ تاریخ اسلام میں ایسی کئی امثلہ موجود ہیں۔ مثال کے طور پر صلحِ حدیبیہ (6 ہجری) کا متن مذکورہ پہلو کا عملی ثبوت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک غیر مسلم ریاست (قریش مکہ) کو ایک آزاد سیاسی حثیت سے تسلیم کیا اور معاہدے کی شرائط کو پوری دیانتداری سے مانا، حالانکہ بظاہر بعض شرائط مسلمانوں کی فِکر حریت کے خلاف تھیں۔[30] اس معاہدے نے بین الاقوامی تعلقات میں معاہداتی اصولوں[31] (pacta sunt servanda) کی بنیاد کو مستحکم کیا۔ اسی طرح نجران کے عیسائیوں کے ساتھ معاہدہ بھی تاریخی مثال ہے۔ ان کے مذہبی اور سیاسی تشخص کو تسلیم کیا گیا اور انہیں اپنے داخلی

---

27 احمد الدردیر، الشرح الکبیر، تحقیق: محمد علیش دار الفکر، بیروت، ج2، ص176۔ / احمد بن ادریس القرافی، الذخیرۃ، تحقیق: محمد بوخبزہ، جلد 3، دار الغرب الاسلامی، بیروت، 1994، ص399۔ / محمد بن جریر الطبری، کتاب الجہاد وکتاب الجزیۃ واحکام المحاربین من کتاب اختلاف الفقہاء لابی جعفر محمد ابن جریر الطبری، تحقیق: جوزف شاخت، بریل، لیڈن، 1933، ص9۔ / علاء الدین السمرقندی، تحفۃ الفقہاء، جلد 3، دار الکتب العلمیہ، بیروت، 1984، ص295۔

28 اسلام کا قانون بین الممالک، ص:340

29 لَا يَنْهَاكُمُ اللهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُم مِّن دِيَارِكُمْ أَن تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ ۚ إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ اللہ تمہیں ان لوگوں سے بھلائی اور انصاف کرنے سے نہیں روکتا جو دین کے معاملے میں تم سے جنگ نہیں کرتے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالتے۔ بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ الممتحنۃ:8

30 مبارکپوری، صفی الرحمان، الرحیق المختوم،

31 **یہ اصول بین الاقوامی قانون کے قاعدہ (1969) Vienna Convention on the Law of Treaties کے مطابق ہے جس کا مطلب ہے ریاستیں اپنے معاھدات کی پابند ہوتی ہیں**

معاملات میں مکمل آزادی دی گئی۔[32] مدینہ میں آپ ﷺ نے یہودی قبائل (بنو قینقاع، بنو نضیر، بنو قریظہ) کو بطور سیاسی و سماجی الگ امتیں تسلیم کیا۔

میثاقِ مدینہ دراصل ایک سٹیٹ چارٹر تھا جس میں مسلمانوں اور یہودیوں کو الگ الگ امتوں کے افراد تسلیم کیا گیا۔ ظاہری بات ہے اس چارٹر میں جو اصول وضوابط مابین اقوام طے پائے تھے ان کے متون سے یہ اندازہ بھی لگایا جاسکتا ہے کہ یہ دور ریاستی ایجنڈے تھے جنہیں رسول اللہ ﷺ کی فہم و فراست سے طے کیا گیا تھا۔ معاہدے کے مطابق کوئی غیر انسانی سلوک ان کے ساتھ روا نہیں رکھا گیا۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ اسلامی نظام نہ صرف مذہبی کثرت کو مانتا ہے بلکہ ریاستی سطح پر بھی دوسروں کی خود مختاری کا احترام کرتا ہے۔

اسلامی تاریخ کے ابتدائی ادوار میں جب مسلمان سلطنتیں معرضِ وجود میں آئیں تو انہوں نے معاہداتی تعلقات کو ترجیح دی۔ مثال کے طور پر مصر، شام اور عراق میں فتوحات کے بعد مقامی آبادی کے ساتھ جو معاہدے کیے گئے، ان میں صریحاً جان و مال اور مذہبی آزادی کی ضمانت دی گئی۔ معاھدہ کسی بھی قوم کے ساتھ اسی وقت سر انجام پاتا ہے جب اس کی وجودی حالت کو تسلیم کیا جاتا ہے ۔ اسلامی ریاست نے ہمیشہ دیگر اقوام اور ریاستوں کو بین الاقوامی شخصیت کے طور پر تسلیم کیا اور ان کے وجود کو مٹانے یا کمزور کرنے کی کوشش نہیں کی۔

اسلامی قانونِ جنگ میں ہتھیاروں کے استعمال کا اصولی دائرہ:

اوائلِ اسلام میں اگرچہ جنگی اسلحہ اپنی ساخت اور اثر پذیری کے اعتبار سے محدود اور سادہ تھا، تاہم مسلم فقہاء نے ان کے استعمال کے حوالے سے جو اصول متعین کیے وہ اس امر کی غمازی کرتے ہیں کہ اسلامی قانونِ جنگ کا بنیادی مقصود دو پہلوؤں پر مرکوز ہے: اول، غیر مقاتلین اور عام شہریوں کے تحفظ کو یقینی بنایا جائے دوم، دشمن کی املاک کو تباہی سے بچایا جائے الا ماشاء الضرورۃ۔ اس دور کی جنگی نوعیت عموماً براہِ راست مقابلہ (فرد بہ فرد یا صف بہ صف قتال) پر مشتمل تھی، جہاں تلوار کو بنیادی ہتھیار کی حیثیت حاصل تھی، جب کہ نیزہ، تیر اور بھالا ثانوی حیثیت میں استعمال کئے جاتے تھے۔ ان ہتھیاروں کی خصوصیت یہ تھی کہ ان کے استعمال سے غیر مقاتلین کی جان و مال کو بلاواسطہ خطرہ لاحق نہیں ہوتا تھا۔ فقہاء نے اس ضمن میں بعض مخصوص ہتھیاروں پر بھی بحث کی، مثلاً زہریلے تیروں کے جواز یا عدمِ جواز پر۔ مالکی فقہاء نے اسے مکروہ یا ممنوع قرار دیا، اس دلیل کے ساتھ کہ دشمن بھی انہی تیروں کو پلٹا کر مسلمان آبادی پر حملہ آور ہو سکتا ہے[33] اور ایسا کرنا نبوی حکمت عملی کے خلاف ہے۔ اس کے برعکس امام محمد الشیبانیؒ (م805ء) نے عسکری مؤثریت کے پیشِ نظر

---

[32] Ahmed El-Wakil, The Prophet's Treaty with the Christians of Najran: An Analytical Study to Determine the Authenticity of the Covenants, *Journal of Islamic Studies*, Volume 27, Issue 3, September 2016, Pages 273–354, https://doi.org/10.1093/jis/etw027

[33] Sohail Hashmi, "Islamic Ethics and Weapons of Mass Destruction: An Argument for Nonproliferation", in Sohail H. Hashmi and Steven P. Lee (eds), Ethics and Weapons of Mass Destruction: Religious and Secular Perspectives, Cambridge University Press, Cambridge, 2004, p. 329

خلیل بن اسحاق بن موسیٰ الجندی، مختصر خلیل فی فقہ امام دار الہجرۃ، تحقیق: احمد علی حرکات، دار الفکر، بیروت، 1994، ص 102 / محمد بن محمد بن عبد الرحمٰن الحطاب، مواہب الجلیل لشرح مختصر خلیل، دار الفکر، بیروت، 1977، طبع ثانی، ج 3، ص 352۔

اس امر کے جواز کی رائے دی ہے۔[34] اسلامی حربی قوانین میں اس طرح کی جنگی صورتحال بھی پیش آئی کہ دشمن قلعہ بندی اختیار کرلیتا اور براہِ راست قتال کی گنجائش باقی نہ رہتی تھی۔ اس تناظر میں مسلم فقہاء نے محاصرہ، منجنیق اور دیگر بھاری ہتھیاروں کے استعمال پر تفصیلی فقہی مباحث مرتب کیے ۔ تاریخی شواہدات سے معلوم ہوتا ہے کہ غزوۂ طائف(8ہجری/630ء) کے دوران حضرت سلمان فارسیؓ نے منجنیق متعارف کرایا تھا،[35] اسلام میں اس ہتھیار کو عسکری ضرورت کے تحت استعمال کیا گیا تھا۔ تاہم منجنیق کے استعمال کے ساتھ ایک بنیادی مسئلہ یہ تھا کہ قلعہ بند ماحول میں عسکری اور غیر عسکری املاک یا مقاتل و غیر مقاتل میں امتیاز ممکن نہ رہتا تھا، جس کے نتیجے میں شہری نقصانات (collateral damage) کا اندیشہ بڑھ جاتا تھا۔ فقہاء نے اس صورتِ حال کو اصول الضرورۃ کے تحت دیکھا اور بالاتفاق منجنیق کے استعمال کو دشمن کے قلعہ پر حملے میں جائز قرار دیا۔ البتہ آگ، سیلاب یا دیگر تباہ کن حربی ذرائع کے استعمال کے بارے فقہاء کے مابین اختلاف پایا گیا۔ بعض نے اسے مطلقاً ممنوع کہا، بعض نے کراہت کے درجے میں رکھا، جبکہ بعض نے عسکری ضرورت کی بنیاد پر اس کی مشروط اجازت دی۔

مسلم فقہاء کی آراء اور مباحث اس امر کی غمازی کرتے ہیں کہ اسلام میں عسکری قوت کے استعمال کو الضرورۃ العسکریۃ (عسکری ضرورت) کے اصول سے مربوط کیا گیا ہے۔ کسی بھی موقع پر بلا امتیاز حملے (indiscriminate attacks) یا ضرورت سے زائد عسکری طاقت کے استعمال کا تصور اسلامی عسکری قوانین میں ناقابلِ قبول رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہتھیاروں کے بارے میں فقہاء نے نہ صرف ہتھیاروں کی نوعیت بلکہ ان کے ممکنہ اثرات پر بھی بحث کی اور جائز وناجائز کے واضح فرق بیان کیے۔ تاہم فقہاء کے درمیان اختلافات اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ انسانی حقوق کے تحفظ میں اسلامی تعلیمات کس قدر جاندار و قابلِ رشک ہیں جہاں دشمن کے غیر جنگجو افراد کے قتل تو کجا بلکہ ان کو ادنیٰ اذیت دینا بھی ناجائز فعل ہے۔

اسلامی حربی اصولوں میں شب خون کی حقیقت:

اسلامی عسکری قوانین میں فقہاء نے انسانی ڈھال (الطتّرس) اور شب خون (البیات) پر خاص بحث کی ہے۔ اگر دشمن عورتوں، بچوں یا اہلِ ذمّہ کو ڈھال بنالے تو فقہاء نے ضرورت کے تحت مشروط طور پر حملے کی اجازت دی ہے، بشرطیکہ مقصد صرف دشمن جنگجو ہوں اور غیر مقاتلین کو نقصان سے حتی المقدور بچایا جائے۔ تاہم اس کی حدود پر اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض فقہاء جیسے ماوردی اور شیرازی کے نزدیک ضرورت اس وقت ہے جب شکست کا خطرہ ہو،[36] جبکہ علامہ قرطبیؒ کے نزدیک ایسا کرنا امت کے اجتماعی تحفظ کے

---

[34] محمد بن الحسن الشیبانی، شرح کتاب السیر الکبیر، شرح: محمد بن احمد السرخسی، تحقیق: ابوعبداللہ محمد حسن محمد حسن اسماعیل الشافعی، دار الکتب العلمیہ، بیروت، 1997، ج 4، ص277۔

[35] محمد بن ادریس الشافعی، الام، طبع ثانی، دار المعرفۃ، بیروت، 1973، ج 4، ص243، 257۔

[36] علی بن محمد بن حبیب الماوردی، کتاب الاحکام السلطانیۃ والولایات الدینیۃ، تحقیق: احمد مبارک البغدادی، مکتبہ دار ابن قتیبہ، کویت، 1989، ص 57۔

لیے جائز ہے۔[37] دوسری طرف، چند فقہاء نے انسانی ڈھال پر حملے کو کلی طور پر ممنوع قرار دیا اور قرآن سے استدلال کیا کہ غیر مقاتلین کی موجودگی میں بلا تفریق حملہ درست نہیں۔[38]

فقہاء نے شب خون (البیات) پر بھی بحث کی ہے۔ چونکہ اندھیرے میں براہِ راست لڑائی ممکن نہ تھی، اس لیے منجنیق یا دیگر ہتھیار استعمال کرنا پڑتے تھے، جو غیر مقاتلین کو بھی متاثر کر سکتے تھے۔ حضرت انس بن مالکؓ کی روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے رات کے وقت دشمن پر حملہ کرنے سے گریز فرمایا۔ لیکن دوسری روایت (الصحاب بن جثامہؓ) میں جب آپ ﷺ سے رات کے حملے کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے اسے کلی طور پر منع نہیں فرمایا۔[39] اسی بنیاد پر فقہاء کے درمیان اختلاف پایا گیا۔ کچھ نے رات کے حملے کو جائز قرار دیا جبکہ بعض نے اسے قبیح سمجھا۔ تاہم عمومی اتفاق اس پر رہا کہ اگر اس عمل سے عورتیں اور بچے متاثر ہوں تو یہ بالواسطہ نقصان (collateral damage) شمار ہوگا، قتل عمد شمار نہیں ہوگا۔[40]

اسلامی عسکری قوانین کے لئے یہ اساسی اصول ہے کہ غیر مقاتلین کی جان و مال محترم و مقدس ہیں اور ان کو دانستہ نقصان پہنچانا ہرگز جائز نہیں۔ عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور مذہبی شخصیات کے تحفظ پر قرآن و سنت نے صراحت کے ساتھ زور دیا ہے، اور فقہاء کا بھی اجماع ہے کہ ان کی جان و مال صرف ناگزیر عسکری ضرورت (military necessity) کی صورت میں بالواسطہ متاثر ہو سکتے ہیں۔ ہمیں یہ اصول سمجھ آتا ہے کہ اسلام اندھا دھند یا بے مہار جنگی کارروائی کی اجازت نہیں دیتا بلکہ جنگ کے دوران بھی اخلاقی اور قانونی طور پر پابند کرتا ہے۔ مزید بر آں ان اصولوں کی تشکیل اس دور کی جنگی صورتحال کے تناظر میں ہوئی جب معرکے زیادہ تر قلعہ بندیوں، منجنیقوں اور براہِ راست میدانِ جنگ کی جھڑپوں پر مشتمل ہوتے تھے۔ ان قواعد کا مقصد مسلم فوج کے طرزِ عمل کو منظم کرنا اور اسے بے جا طاقت کے استعمال سے روکنا تھا۔ اسلام نے یہ ضوابط اس وقت بھی نافذ کیے جب دشمن فریق نہ ان اصولوں کا پابند تھا اور نہ کسی معاہدے کے تحت ان کو تسلیم کرتا تھا۔ اس امر سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اسلامی قانونِ جنگ محض ایک عسکری حکمتِ عملی نہیں بلکہ ایک ہمہ گیر اخلاقی و قانونی فریم ورک ہے۔

غزہ میں جاری عسکری دہشت گردی پر ایک نظر:

غزہ میں جاری عسکری دہشتگردی میں جدید ہتھیاروں کا استعمال اسلامی قانونِ جنگ کے اس اصول کے برعکس ہے، جس میں غیر مقاتلین اور شہری املاک کو نقصان سے محفوظ رکھنے کی ہدایت دی گئی تھی۔ مختلف رپورٹس کے مطابق اسرائیلی افواج نے شہری آبادی پر بارہا بھاری فضائی بمباری کی، جس میں GBU-31 اور GBU-39 نوع کے ایئر-ڈیلیورڈ بم، آرٹلری شیلز، اور دیگر دھماکہ خیز

---

37 محمد بن احمد الانصاری القرطبی، الجامع لأحکام القرآن، دار الشعب، قاہرہ، ج 16، ص 287 ومابعد۔

38 لَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُونَ وَنِسَاءٌ مُّؤْمِنَاتٌ لَّمْ تَعْلَمُوهُمْ أَنْ تَطَئُوهُمْ فَتُصِيبَكُم مِّنْهُم مَّعَرَّةٌ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۖ لِيُدْخِلَ اللَّهُ فِي رَحْمَتِهِ مَن يَشَاءُ ۚ لَوْ تَزَيَّلُوا لَعَذَّبْنَا الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا

39 مسلم بن الحجاج القشیری، صحیح مسلم، تحقیق: محمد فؤاد عبد الباقی، ج 3، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ص 1364 ومابعد۔ حدیث 1745

40 محمد بن علی بن محمد الشوکانی، نیل الأوطار: من أحادیث سید الأخیار شرح منتقی الأخبار، جلد 8، دار الجیل، بیروت، 1973، ص 71۔

آلات شامل تھے۔ ان ہتھیاروں کے نتیجے میں نہ صرف غیر مقاتلین بلکہ عورتیں، بچے خدمت گزار عملہ اور طبی عملہ بھی بڑے پیمانے پر ہلاک وزخمی ہوئے۔[41] اقوامِ متحدہ کے انسانی حقوق دفتر (OCHA) کی ایک رپورٹ کے مطابق 7 اکتوبر 2023 کے بعد ہزاروں افراد غزہ میں جاں بحق ہو چکے ہیں جن میں بچوں کا تناسب پُر اسرار طور پر زیادہ ہے۔[42] انسانی حقوق واچ (HRW) اور ایمنسٹی انٹرنیشنل نے اپنی مشترکہ تحقیقات کے نتیجے میں یہ اعلامیہ جاری کیا کہ اسرائیلی حملوں میں بھاری دھماکہ خیز ہتھیاروں کا شہری مراکز پر استعمال بین الاقوامی قانون کی کھلی خلاف ورزی ہے۔[43] مزید برآں، Explosive Weapons Monitor کے مطابق شہری آبادی والے علاقوں پر بارودی ہتھیاروں کے استعمال سے "collateral damage" کی شرح خوفناک حد تک بڑھ چکی ہے، جس کے نتیجے میں ہسپتال، اسکول اور امدادی مراکز بھی تباہ ہوئے۔[44] طبی جرائد اور تنظیموں کی رپورٹس نے بھی واضح کیا ہے کہ دھماکہ خیز ہتھیاروں کے نتیجے میں صرف فوری اموات بلکہ شدید جلنے کے زخم اور پیچیدہ اعصابی وعضوی زخم بھی آئے۔[5] اس تسلسل نے دو سال سے زیادہ عرصہ جاری رہ کر نہ صرف نسل کشی کی داغ بیل ڈالی بلکہ عالمی سطح پر ان قوانینِ جنگ کے نفاذ پر بھی سوالیہ نشان کھڑا کر دیا جو اسلامی اصولوں سے ماخوذ ہیں۔

اسلام میں اخلاقیات کو دین کا ستون قرار دیا گیا ہے۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر افراد اور ریاستوں کے مابین تعلقات اور معاملات استوار ہوتے ہیں۔ کسی بھی انسان قوم یا ریاست کے ساتھ ایسا سلوک روا نہیں رکھا جا سکتا جو اخلاقی اقدار اور انسانی حرمت کے منافی ہو۔ اسی لیے غلامی، تذلیل، ظلم وجبر اور کسی بھی نوع کی زبردستی کو اسلام نے ممنوع قرار دیا ہے۔ اسی طرح مکانات اور بستیوں کی تباہی، انسانوں کو ان کے گھروں اور زمینوں سے بے دخل کرنا، یا عزت وآبرو کی پامالی بھی اصولِ حرب کے تناظر میں حرامِ مطلق ہے۔ حتیٰ کہ اگر دشمن بدترین اور غیر اخلاقی طرزِ عمل اختیار کرے تب بھی مسلمان کو بدلے میں اسی منہج پر نہیں اترنا چاہئے، کیونکہ عزت وکرامت زمین پر اللہ کی مقدس اقدار میں سے ہے، جو ہر حال میں غیر متبدل اور غیر مشروط رہتی ہے۔ یہ حرمت کسی کے مذہب، عقیدے، جنس یا تعلق سے مشروط نہیں۔ اسلامی نکتہ نظر سے جرم اور گناہ خواہ دوست سے سرزد ہوں یا دشمن سے، بہر حال ممنوع عمل ہے اور اس پر گرفت لازم ہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے سپہ سالار حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو لکھا:

"میں تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو حکم دیتا ہوں کہ دشمن کے ساتھ بھی گناہوں سے بچو، کیونکہ لشکر کے گناہ دشمن سے زیادہ خوفناک ہیں۔ مسلمان اپنے دشمن کی نافرمانی کی بدولت غالب آتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تا تو ان کی تعداد ہم سے زیادہ ہے، ان کے ساز وسامان ہم سے بہتر ہیں۔ پس اگر ہم بھی ان کی طرح بداعمالی کریں تو وہ ہم پر غالب آجائیں گے۔ جان لو کہ فتح ہماری نیکیوں اور قدروں کے باعث ہے، قوت وطاقت کے بل پر ہم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔(...) یہ نہ کہنا کہ ہمارے دشمن ہم سے بدتر ہیں لہٰذا اگر ہم بھی برائی کریں تو

[41] *Human Rights Watch, Israel/Palestine: Unlawful Israeli Strikes Kill Civilians in Gaza,* October 2023
42 United Nations Office for the Coordination of Humanitarian Affairs (OCHA), *Hostilities in the Gaza Strip and Israel – Situation Report*, December 2023, https://ochaopt.org/reports
[43] *Amnesty International, Israel/OPT: Evidence of War Crimes in Gaza, November 2023, https://www.amnesty.org/en/latest/news/2023/11/israel-opt-evidence-of-war-crimes-in-gaza*
44Explosive Weapons Monitor, *Patterns of Harm in Gaza 2023–24, 2024, https://www.explosiveweaponsmonitor.org.*

ہمیں کچھ نہ ہو گا، کیونکہ کتنی ہی قومیں ان سے بدتر قوموں کے ہاتھوں مغلوب ہوئی ہیں۔"[45] مذکورہ روایت اس حقیقت کو اجاگر کرتی ہے کہ اسلام کی اصل قوت عسکری طاقت نہیں بلکہ اعلیٰ اخلاقی اقدار اور عمل صالح ہے۔ یہی وہ سرمایہ ہے جو امت مسلمہ کو عزت و غلبہ عطا کرتا ہے۔

غزوات بنوی و جینوا کینونشنز: قیدیان حرب کے تناظر میں

وَيُطْعِمُونَ ٱلطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِۦ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا۔[46]

اسلامی قانونِ جنگ میں جنگی قیدیوں سے متعلق اکثر اصول غزوات بنوی ﷺ سے ماخوذ ہیں۔ اس وقت "جنگی قیدی" کی اصطلاح صرف مرد جنگجوؤں کے لئے استعمال کی جاتی تھی، کیونکہ اُس زمانے کا رواج یہ تھا کہ عورتیں اور بچے اگر گرفتار ہو جاتے تو یا تو غلام بنالئے جاتے یا پھر مسلمان قیدیوں کے بدلے میں واپس کر دیے جاتے تھے۔ غزوۂ بدر کے موقع پر مسلمانوں نے دشمن کے ستر جنگجو گرفتار کر لئے۔ یہ نوزائیدہ اسلامی ریاست کے لئے ایک بڑا مسئلہ تھا کیونکہ ابھی تک جنگی قیدیوں کی قانونی حیثیت کے بارے میں کوئی واضح ضابطہ تشکیل نہ پایا تھا۔ اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کرامؓ سے قیدیوں سے سلوک کے متعلق مشورہ فرمایا ۔ ایک اور مشکل یہ درپیش تھی کہ ستر قیدیوں کے قیام و طعام کا کوئی باقاعدہ انتظام نہ تھا۔ اس لیے بعض قیدیوں کو مسجد میں رکھا گیا اور باقی صحابہ کرامؓ میں تقسیم کر دیے گئے تاکہ وہ ان کے گھروں میں قیام کر سکیں۔ رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ **قیدیوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو۔**"[47] فقہاءِ اسلام نے جنگی قیدیوں کے متعلق احکام نصوص قطعیہ سے اخذ کئے ہیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ:

فَإِذَا لَقِيتُمُ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ فَضَرْبَ ٱلرِّقَابِ حَتَّىٰٓ إِذَآ أَثْخَنتُمُوهُمْ فَشُدُّواْ ٱلْوَثَاقَ فَإِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَآءً حَتَّىٰ تَضَعَ ٱلْحَرْبُ أَوْزَارَهَا[48]

کہ جب کافروں سے جنگ ہو اور وہ مغلوب ہو جائیں تو انہیں قید کیا جائے اور بعد ازاں یا تو احسان کر کے رہا کر دیا جائے یا فدیہ کے بدلے آزاد کیا جائے۔

فَإِذَا ٱنسَلَخَ ٱلْأَشْهُرُ ٱلْحُرُمُ فَٱقْتُلُواْ ٱلْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَٱحْصُرُوهُمْ وَٱقْعُدُواْ لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ[49]

---

[45] جمال ایاد، نظم الحرب فی الاسلام (اسلام میں جنگ کے قواعد)، مکتبۃ الخانجی، قاہرہ، 1951، ص۔ 43۔

[46] (الدہر:8)

[47] محمد بن جریر الطبری، تاریخ الطبری: تاریخ الامم والملوک، دار الکتب العلمیہ، بیروت، 2001، ج 2، ص39۔

[48] سورۃ محمد:4

[49] سورۃ التوبۃ:05

جبکہ دوسری آیت میں مشرکین کے ساتھ عمومی جنگی حکمتِ عملی کا ذکر ہے، قیدیوں کے مسئلے کا براہِ راست نہیں۔ انہی نصوص کی روشنی میں فقہا تین بڑے گروہوں میں منقسم ہوئے۔ پہلے گروہ میں ابن عباسؓ، عبداللہ بن عمرؓ، حسن بصریؒ اور سعید بن جبیرؒ شامل ہیں، جن کے نزدیک قیدیوں کے بارے میں حکم صرف دو ہی صورتوں پر مبنی ہے: یا تو انہیں احساناً چھوڑ دیا جائے یا فدیہ کے عوض رہا کیا جائے۔[50] دوسرا گروہ بعض حنفی فقہا پر مشتمل ہے، جن کا مؤقف ہے کہ ریاست کا سربراہ حالات کی مناسبت سے قیدیوں کو قتل کرنے یا غلام بنانے کا بھی اختیار رکھتا ہے، جبکہ امام محمد الشیبانیؒ نے دشمن کے قیدیوں کے تبادلے کو بھی جائز قرار دیا۔ باقی حنفی فقہا کا یہ مؤقف تھا کہ قیدی اسلامی ریاست میں رہ سکتے ہیں بشرطیکہ وہ جزیہ ادا کریں، تاہم انہیں واپس اپنی سرزمین جانے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے تاکہ دشمن کی طاقت میں اضافہ نہ ہو۔[51]

تیسرا اور جمہور فقہا کا موقف یہ ہے کہ مقتدرِ ریاست کو قیدیوں کے بارے میں چار اختیارات حاصل ہیں: وہ چاہے تو بعض یا تمام قیدیوں کو قتل کر دے، غلام بنا لے، آزاد کر دے یا مسلمان قیدیوں کے بدلے ان کا تبادلہ کر لے۔ مالکیہ نے اس میں مزید یہ رائے بھی شامل کی کہ اگر قیدی اسلامی ریاست میں رہتے ہوئے جزیہ ادا کریں تو ان کی آزادی بھی ممکن ہے۔[52] یہاں یہ وضاحت قابلِ ذکر ہے کہ بعض فقہاء کے نزدیک قیدیوں کو قتل کرنے کی اجازت، اصولی طور پر، صرف اُن صورتوں میں ہے جب یہ قتل مسلمانوں کے مفاد میں ہو۔ اس موقف کی بنیاد رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ میں صرف تین قیدیوں کے قتل پر رکھی گئی ہے۔ ان میں سے دو بدر کے موقع پر (مارچ ۶۲۴ء) قتل کیے گئے : نضر بن حارث اور عقبہ بن ابی معیط۔ تیسرا شخص ابو عَزّہ جُمَحی تھا، جو اُحد کی جنگ (مارچ ۶۲۵ء) میں مارا گیا۔[53]

روایاتِ تاریخ کے مطابق ابو عَزّہ کو سب سے پہلے غزوۂ بدر میں قید کیا گیا تھا۔ اس نے رسول اللہ ﷺ سے اپنی غربت اور کثرتِ عیال کے بارے منت سماجت کر کے رہائی کی درخواست کی، تو آپ ﷺ نے اسے اس شرط پر آزاد کر دیا کہ وہ دوبارہ مسلمانوں کے خلاف لڑائی میں شریک نہ ہو گا۔ لیکن اگلے ہی سال جب غزوۂ اُحد میں وہ دوبارہ قیدی بنایا گیا تو اپنے وعدے کی خلاف ورزی پر اُسے قتل کر دیا گیا۔[54] ان روایات کی صحت و سند خواہ کسی درجے میں ہو، اور چاہے یہ افراد میدانِ جنگ میں قتل کیے گئے ہوں یا قید کے بعد، تاریخی حقیقت یہی ہے کہ ان تین افراد کو عام قیدیوں کی حیثیت سے قتل نہیں کیا گیا، بلکہ انہیں اُن جرائم کی بنیاد پر سزائے دی گئی جو وہ مدینہ

---

50 یوسف القرضاوی، فقہ الجہاد: دراسہ مقارنہ لاحکامہ وفلسفتہ فی ضوء القرآن والسنۃ، مکتبہ وہبہ، قاہرہ، 2009، ج 2، ص 854 ومابعد۔

Muḥammad Ḥammīdullāh, Muslim Conduct of State: Being a Treatise on Siyar, That is Islamic Notion of Public International Law, Consisting of the Laws of Peace, War and Neutrality, Together with Precedents from Orthodox Practice and Preceded by a Historical and General Introduction, rev. and enl. 5th ed., Sh. Muhammad Ashraf, Lahore, 1968, p. 214// Lena Salaymeh, "Early Islamic Legal-Historical Precedents: Prisoners of War", Law and History Review, Vol. 26, No. 3, 2008, p. 528.

51 عبداللہ بن محمود بن مودود، الاختیار لتعلیل المختار، مرتب: عبد اللطیف محمد عبد الرحمن، طبع ثالث، دار الکتب العلمیہ، بیروت، 2005، ج 4، ص 133۔

52

53 محمد بن عمر الواقدی، کتاب المغازی، تحقیق: محمد عبد القادر عطا، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، 2004 ج 1، ص 135، 263۔

54 النووی، ص: 83

ہجرت سے قبل مکّہ میں مسلمانوں کے خلاف مہمات شروع کر چکے تھے۔ اگر محض قیدی ہونا ہی قتل کی بنیاد ہوتا تو بدر اور دیگر غزوات کے تمام قیدیوں کو قتل کر دیا جاتا، جب کہ ایسا نہیں ہوا۔[55]

قیدیوں کے بارے میں فقہا کے متنوع اور بظاہر متضاد احکام عصرِ حاضر میں ایک اہم سوال کو جنم دیتے ہیں کہ ان میں سے کون سا حکم "حقیقی اسلامی تعلیمات" کی نمائندگی کرتا ہے؟ دوسرے لفظوں میں، کون سا ضابطہ اس مصلحتِ عامہ (مصلحہ) کو پورا کرتا ہے جو فقہاء کے تشکیل کردہ دیگر احکام کی بنیاد ہے۔ اسلامی قانونِ جنگ کا ایک اچھوتا اصول یہ ہے کہ قیدیوں کے ساتھ انسانی اور شائستہ سلوک کیا جائے۔ اس کی بڑی مثال یہ ہے کہ غزوۂ بدر کے قیدیوں کو یا تو مسجد میں رکھا گیا یا پھر صحابہ کرامؓ کے گھروں میں تقسیم کر دیا گیا، اور ان پر یہ ہدایت کی گئی کہ وہ قیدیوں کے ساتھ حسنِ سلوک روا رکھیں۔ اُس دور میں قیدیوں کے لیے جیلیں یا باقاعدہ کیمپ موجود نہ تھے، اس لیے انہیں کھلے میدان میں باندھ کر چھوڑ دینا ممکن نہ تھا، کیونکہ ایسا کرنے سے ان کی جان کو خطرات لاحق ہو سکتے تھے۔[56] مطالعہ سیرتِ رسول ﷺ سے معلوم ہوتا ہے کہ بدر کے قیدیوں کے ساتھ جو حسنِ سلوک کیا گیا وہی اسلامی قانون میں قیدیوں کے بنیادی اصولوں کی بنیاد بنا۔ یہ اصول کئی پہلوؤں سے جنیوا کنونشن سوئم (GC III) کی دفعات کے مطابق ہیں، مثلاً قیدیوں کو مناسب پناہ گاہ، خوراک اور لباس فراہم کرنا، ان کے خاندانی روابط کو برقرار رکھنا اور ان سے جنگی معلومات حاصل کرنے کے لیے تشدد کی ممانعت۔ بدر کے قیدیوں کو مسجد اور صحابہ کے گھروں میں ٹھہرانا اس بات کی دلیل ہے کہ انہیں ہر طرح کے نقصان سے محفوظ رکھا گیا۔ خوراک کے بارے میں بعض قیدیوں نے خود بیان کیا کہ مسلمانوں نے انہیں اپنی استطاعت کے مطابق بہترین کھانا دیا اور حتیٰ کہ بعض اوقات قیدیوں کو اپنی ذات پر ترجیح دی۔[57] ابو عزیز بن عمیر کی روایت ہے، جیسا کہ اے۔ گیلوم نے ترجمہ کیا ہے:

I was with a number of the Anṣār when they [the Muslim captors] brought me from Badr, and when they ate their morning and evening meals they gave me the bread and ate the dates themselves in accordance with the orders that the apostle had given about us. If anyone had a morsel of bread he gave it to me. I felt ashamed and returned it to one of them but he returned it to me untouched.[58]

---

[55] یوسف القرضاوی، فقہ الجہاد: دراسہ مقارنہ لاحکامہ وفلسفتہ فی ضوء القرآن والسنۃ، مکتبہ وہبہ، قاہرہ، 2009ج2،، ص858 ومابعد۔ / محمد حسین ہیکل، حیاتِ محمدؐ، آٹھویں ایڈیشن سے ترجمہ: اسماعیل راجی الفاروقی، نارتھ امریکن ٹرسٹ پبلیکیشن، 1976، ص233،239۔

Troy S. Thomas, "Jihad's Captives: Prisoners of War in Islam", U.S. Air Force Academy Journal of Legal Studies, Vol. 12, 2002–03, pp. 94 ff.; Troy S. Thomas, "Prisoners of War in Islam: A Legal Inquiry", The Muslim World, Vol. 87, No. 1, 1997, p. 49.

[56] احمد ابو الوفا، **النظریہ العامہ للقانون الدولي الإنساني في القانون الدولي وفي الشريعة الإسلامية**، دار النھضۃ العربیۃ، قاہرہ، 2006ء، ص 179-//طبری:ص:39

Muḥammad Ḥammīdullāh, Muslim Conduct of State: Being a Treatise on Siyar, That is Islamic Notion of Public International Law214:

[57] ایضا

[58] A. Guillaume (trans.), The Life of Muhammad: A Translation of Isḥāq's Sīrat Rasūl Allāh, Oxford University Press, Oxford, 1955, p. 309.

عبد الملک ابن ہشام ابن ایوب الحِمیری، **السیرۃ النبویۃ**، تحقیق: عمر عبد السلام تدمری، دار الکتب العربی، بیروت، 1990ء ج2،، ص287۔

"میں انصار کے ایک گروہ کے ساتھ بدر سے مدینہ لایا گیا۔ جب وہ صبح و شام کھانا کھاتے تو مجھے روٹی دیتے اور خود کھجوروں پر اکتفا کرتے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ہمارے بارے میں یہ ہدایت دی تھی۔ اگر ان میں سے کسی کے پاس روٹی کا ایک لقمہ بھی ہوتا تو وہ مجھے دیتا۔ مجھے شرم محسوس ہوتی اور میں واپس کر دیتا، مگر وہ بغیر کھائے ہوئے پھر میرے سامنے رکھ دیتا۔"

سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کا طرزِ عمل قابلِ ذکر ہے کہ جب فتح بیت المقدس کے بعد کثیر تعداد میں قیدی ان کے قبضے میں آئے اور وہ سب کے لیے خوراک مہیا کرنے پر قادر نہ تھے تو انہوں نے انہیں آزاد کر دیا۔ یہ رویہ قیدیوں کے ساتھ انسانی ہمدردی اور اسلامی تعلیمات کا مظہر ہے۔[59] مزید بر آں، فقہا نے اصول وضع کیا کہ قیدیوں کو ان کے خاندان سے جدا نہ کیا جائے تاکہ والدین اور اولاد کے تعلقات بر قرار رہیں۔

یہی اصول آج کے عالمی قوانین میں بھی نظر آتے ہیں۔ جنیوا کنونشن سوئم (GC III) کے آرٹیکل 17 کے مطابق قیدیوں سے معلومات لینے کے لیے جسمانی یا ذہنی دباؤ ڈالنا ممنوع ہے اور اگر وہ جواب نہ دیں تو انہیں کسی بھی قسم کی سزا یا ذلت آمیز سلوک کا نشانہ نہیں بنایا جاسکتا۔[60]

اسلامی قانون میں امان کا تصور:

اسلامی نظام امان (Protection, Safety) دو بڑی صورتوں پر مشتمل ہے۔ پہلی صورت Safe Conduct ہے، جو کسی دشمن ریاست کے غیر مسلم شہری کو عارضی طور پر اسلامی ریاست میں داخلے کے لیے فراہم کی جاتی ہے۔ یہ داخلہ صرف پُر امن مقاصد جیسے کاروباری سرگرمیاں، تعلیم و تعلم یا سیاحت تک محدود ہوتا ہے۔ اس حوالے سے نظامِ امان کی مثال جدید ریاستوں میں ویزا یا عارضی اقامت نامے سے مشابہ ہے، کیونکہ یہ اجازت باقاعدہ ریاستی مقتدر اداروں کے ذریعے عطا کی جاتی ہے اور اس کے حاملین کو کچھ بنیادی حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ جس فرد کو اس قسم کی امان حاصل ہو، اس پر حملہ نہیں کیا جاسکتا، نہ ہی اس پر اسلامی حدود سے باہر کیے گئے جرائم کی بنیاد پر مقدمہ قائم کیا جاسکتا ہے، حتیٰ کہ اگر وہ کسی مسلمان کے قتل میں ملوث ہی کیوں نہ رہا ہو۔[61] مزید بر آں غیر ملکی سفیروں اور ایلچیوں کو بھی اپنی سفارتی حیثیت کے باعث یہ تحفظ از خود حاصل ہوتا ہے۔ اسلام نے اس روایت کو نہ صرف بر قرار رکھا بلکہ اسے ایک لازم اور ناقابلِ تنسیخ معاہدہ قرار دیا، اگرچہ فقہاء کے مابین اس امر پر اختلاف رہا کہ جاسوسی کے مرتکب مستأمن کی امان منسوخ کی جاسکتی ہے یا نہیں۔ بہر حال اس پر حملہ جائز نہیں بلکہ اسے باعزت طور پر واپس اس کے وطنِ اصلی بھیجنا لازم ہے۔ اور اگر سفیروں یا ایلچیوں کو قتل کیا جائے تو اسلامی بین الاقوامی قوانین کے تحت قاتلین سے بدلہ لیا جائے گا اس کی کئی صورتیں ہو

---

[59] دلیلہ مبارکی، ضوابط العلاقات الدولیۃ فی الإسلام زمن الحرب"، مجلۃ کلیۃ العلوم، سال 4، شمارہ 9، 2004ء، ص 206۔

[60] No physical or mental torture, nor any other form of coercion, may be inflicted on prisoners of war to secure from them information of any kind whatever. Prisoners of war who refuse to answer may not be threatened, insulted, or exposed to any unpleasant or disadvantageous treatment of any kind.

Geneva Convention relative to the Treatment of Prisoners of War, 75 U.N.T.S. 135, entered into force Oct. 21, 1950.

[61] محمد بن حسن الشیبانی، السیر، مرتبہ: مجید خدوری، دار الفکر، بیروت، 1985، ص 179۔

سکتی ہیں۔ حضرت حارث بن عمیر ازدی کو شام کے علاقے بصری کی طرف بھیجا گیا جن کو شرحبیل بن عمرو الغسّانی نے بغیر کسی وجہ کے شہید کر دیا تھا [62]

امان کی صورتِ ثانی **Quarter** کہلاتی ہے، جس کا تعلق براہِ راست میدانِ جنگ سے ہے۔ مثلاً اگر کوئی دشمن جنگجو لڑائی ترک کرنے اور تحفظ کا خواہاں ہو تو مسلمانوں پر لازم ہے کہ اس کے خلاف قتال روک دیں اور نہ صرف اس کی جان بلکہ اس کے مال و متاع کی حفاظت بھی مسلمانوں پر لازم ہے جب تک کہ وہ اپنے وطن واپس نہ لوٹ جائے۔ ایسے افراد کو قیدیِ جنگ (PoWs) نہیں سمجھا جاتا اور نہ ہی ان کی گرفتاری کی جا سکتی ہے۔ اس امان کا حصول مختلف طرق سے ممکن ہے: تحریری یا زبانی اعلان کے ذریعے، کسی بھی زبان میں، واضح یا غیر واضح الفاظ کے ساتھ، یا محض کسی اشارے کے ذریعے۔[63] یہ اصول بین الاقوامی انسانی قانون (IHL) میں بھی نظر آتا ہے جہاں Article 41 of Additional Protocol I کے تحت وہ دشمن جو "بالنیہ ہتھیار ڈال دیں"، **hors de combat** کے درجے میں شمار ہوتے ہیں۔[64]

مذکورہ بحث میں فقہاء کی آراء یہ ہیں کہ امان کا مقصد دراصل حقن الدم (خونریزی کی روک تھام اور انسانی جان کا تحفظ) ہے،[65] لہٰذا اگر دشمن کو غلطی سے یہ گمان ہو جائے کہ کسی مسلمان نے اسے امان دی ہے تو بھی وہ امان معتبر ہو گی، خواہ مسلمان کا ایسا کوئی ارادہ نہ ہو۔ اسی نوعیت کا ایک اور اختلاف مذکور ہے کہ قیدی بنائے جانے کے بعد بھی امان دی جا سکتی ہے یا صرف گرفتاری سے قبل؟۔ یہ اختلاف بذاتِ خود اس امر کی دلیل ہے کہ اسلامی قانون کے مطابق امان کو گرفتاری کے بعد بھی نافذ کیا جا سکتا ہے۔ فقہاء میں سے ابن قدامہ حنبلیؒ نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ اگر کوئی دشمن غیر مسلح طور پر اور پُر امن طریقے سے اسلامی حدود میں داخل ہو تو وہ محض اس عمل کے باعث امان کا حقدار ہے۔ یہ اصول اُس جدید حربی روایت سے مشابہ ہے جس میں دشمن سفید جھنڈا لہرا کر امن کا داعی قرار پاتا ہے اور اس پر حملہ ممنوع ہو جاتا ہے۔

جناب عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے شاید اپنی زندگی میں ایک ہی فارسی کا لفظ بولا ہو گا "مترس" "تو مت ڈر" اس لفظ کا پسِ منظر صحیح بخاری کی ایک روایت ہے جو اسلام کے قانونِ جنگ کے تصور امان کے بارے میں ہے۔ آپ رضی اللہ نے فرمایا اگر میرے کسی سپاہی نے کسی ایرانی حربی کو یہ کہا مترس" اور پھر اسے قتل کر دیا تو میں اس کے خلاف قصاص کا مقدمہ چلاوں گا اور بدلے میں اسے قتل کروں گا ۔[66] ایسا ہوا بھی کہ ایک نو مسلم ایرانی سپاہی نے کسی درخت کی اوٹ میں چھپے شخص کو مترس کہ کر پاس بلوایا اور قتل کر دیا اس مقدمہ کا

---

[62] عباس شومان، العلاقات الدولية في الشريعة الإسلامية، سلسله الدراسات الفقهية، شماره 1، الدار الثقافية للنشر، قاہرہ، 1999، ص106۔

[63] الخطيب الشربيني، مغني المحتاج إلى معرفة معاني ألفاظ المنهاج، ج4، دار الفكر، بيروت، ص237۔

[64] API, Art. 41(2)(b). https://ihl-databases.icrc.org/en/ihl-treaties/api-1977/article-41/commentary/1987?utm_source=chatgpt.com

[65] محمد بن حسن الشيباني، ص:273

[66] قال ابن عمر فجعل خالد يقتل، فقال النبي صلى الله عليه وسلم:" ابرا إليك مما صنع خالد، وقال عمر: إذا قال مترس فقد آمنه إن الله يعلم الالسنة كلها، وقال: تكلم لا باس " عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے کہا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے (بنی

فیصلہ جناب عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا آپ نے فرمایا اب کے بعد ایسا ہوا تو سزائے موت دوں گا۔[67] کیا ایسا نظامِ جنگ کسی اور مذہب کے لیٹریچر میں موجود ہو گا؟[68] لہذا معلوم ہوا کہ اسلام میں دشمن کے خون اور مال کی حرمت مسلم ہے۔ دشمن پر حملہ صرف اس وقت جائز ہے جب وہ حالتِ قتال میں ہو، لیکن جیسے ہی وہ قتال ترک کر دے اور نظامِ امان کے تحت پناہ طلب کرے، اسلامی قانون اس کی حفاظت کو لازم قرار دیتا ہے۔ اس کا مقصد صرف ایک ہے: خونریزی کو روکنا اور جنگ کی تباہ کاریوں و انسانی مصائب کو کم سے کم کرنا۔

لاشوں کی تدفین اور انسانی وقار کا تحفظ

انسانی احترام (Human Respect) ایک ایسا فریضہ ہے جو عطائے باری تعالی ہے،[69] اور یہ احترام وجودِ انسان کو لازم ہے اگرچہ زندہ ہو یا مردہ۔ رسول اکرم ﷺ کی وہ احادیث، جن میں دشمن جنگجوؤں کے چہروں پر جان بوجھ کر ضرب لگانے سے منع فرمایا گیا[70] کیونکہ ایسا کرنا انسانی وقار کی خلاف ورزی ہے۔ عہدِ قدیم میں لاشوں کا مثلہ کیا جاتا تھا لاشوں کو مسمار کیا جاتا تھا تاکہ پہچان ختم کر دی جائے۔ ایسا عمل کرنے سے دشمن کا غصہ ختم ہو جاتا اور دشمن کی دیرینہ منتیں پوری ہوا کرتیں تھیں جبکہ اسلام میں ایسا کرنے سے سختی سے منع کیا گیا۔ اسلام کے قانونِ جنگ میں لاشیں گرانا مقصود نہیں ہے بلکہ دشمن کا زور توڑنا مقصود ہے دشمن کا زور دو افراد کے قتل سے بھی ٹوٹ سکتا ہے اور بغیر قتل کئے صرف آلاتِ حرب تباہ کرنے سے بھی زور ٹوٹ سکتا ہے۔ ڈرانے دھمکانے سے بھی ٹوٹ سکتا ہے۔ یہ بات بھی فقہاء کے ہاں زیر بحث رہی ہے کہ کسی ہتھیار کو زہر آلاد کر کے دشمن پر وار کر کے مکمل آبادی یا چھاونی تباہ کرنے سے گریز کیا جائے کہ ایسا کرنا اسلام کا مقصود نہیں ہے۔ (یہ بات اختلافی ہے اور مالکی فقہاء کے ہاں رواج پزیر ہے)[71]

کلاسیکل اسلامی حربی قوانین میں مسلمانوں کی لاشوں کی تدفین سے متعلق واضح اصول مرتب کیے گئے ہیں، خواہ یہ عام حالات ہوں، جنگی حالات ہوں یا قدرتی آفات۔ عام حالات میں وفات پانے والے مسلمان کے لیے غسل، کفن اور نمازِ جنازہ کی ادائیگی کے فرائض،

ہدیہ کی جنگ میں) کافروں کو مارنا شروع کر دیا، حالانکہ وہ کہتے جاتے تھے۔ ہم نے دین بدل دیا، ہم نے دین بدل دیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ حال سنا تو فرمایا، یا اللہ! میں تو خالد کے کام سے بیزار ہوں، اور عمر رضی اللہ عنہ نے کہا، کہا جب کسی (مسلمان) نے (کسی فارسی آدمی سے) کہا کہ «مترس. «مت ڈرو تو گویا اس نے اسے امان دے دی، کیونکہ اللہ تعالیٰ تمام زبانوں کو جانتا ہے اور عمر رضی اللہ عنہ نے (ہرمزان سے) کہا (جب اسے مسلمان گرفتار کر کے لائے) کہ جو کچھ کہنا ہو کہو، ڈرو مت۔ صحيح البخاري، كِتَاب الْجِزْيَةِ والموادعه، بَابُ إِذَا قَالُوا صَبَأْنَا وَلَمْ يُحْسِنُوا أَسْلَمْنَا حديث2-3173

[67] اسلام کا نظام بین الممالک، ص:340

[68] Muwaffaq al-Dīn ʿ Abd Allah ibn Aḥmad ibn Qudāmah, Al-Kāfī fī Fiqh al-Imām Aḥmad Ibn Ḥanbal, ed. MuḥammadFāris and Musʿad ʿAbdal-Ḥamīd al-Saʿdanī, Vol. 4, Dār al-Kutub al-ʿ Ilmiyyah, Beirut, 2004, p. 163.

[69] وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَٰهُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَٰهُم عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا

[70] وعن ابي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم:«إذا قاتل احدكم فليجتنب الوجه أخرجه البخاري، العتق، باب إذا ضرب العبد فليجتنب الوجه، حديث:2559، ومسلم، البر والصلة، باب النهي عن ضرب الوجه، حديث:2612

[71] اسلام کا قانون بین الممالک، ص:343

جبکہ شہداء کے بارے میں حکم یہ ہے کہ انہیں غسل اور کفن دیے بغیر اور حتیٰ کہ نمازِ جنازہ کے بغیر دفن کیا جائے، تاکہ ان کی قربانیوں کو خراجِ تحسین پیش کیا جا سکے۔[72] اسی طرح قبرستانوں کی حرمت پر زور دیا گیا ہے، اور فقہاء نے قبر کشائی، اجتماعی قبروں (قدرتی آفات یا جنگوں کی صورت میں)، اور سمندر میں تدفین جیسے مسائل پر تفصیلی بحث کی ہے۔ تدفین کے اسلامی اصولوں کے مطابق ہر میت کو الگ قبر میں دفن کیا جانا چاہیے، سوائے اس صورت کے جب ناگزیر حالات (قدرتی آفات یا جنگی ماحول) اس کی اجازت نہ دیں۔ رسول اکرم ﷺ کے فرمان کی روشنی میں مسلمانوں پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ دشمن کی لاشیں ان کے وارثوں یا رفقاء کے حوالے کرنا لازم ہے، اور اگر وہ ایسا کرنے سے انکار کر دیں تو ان لاشوں کی تدفین خود مسلمان فوج کے ذمے آتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر لاشوں کو دفن نہ کیا جائے تو وہ گل سڑ جائیں گی یا درندوں کا شکار ہو جائیں گی، اور یہ صریحاً مثلہ (Mutilation) کے مترادف ہوگا، جیسا کہ اندلسی فقیہ **ابن حزم** (م1064ء) نے وضاحت کی۔[73] روایت ملتی ہے کہ رسول اکرم ﷺ دشمن کی لاشوں کو بھی کسی امتیاز کے بغیر دفن فرمایا کرتے تھے۔ اس سے یہ اصول واضح ہوتا ہے کہ اسلام میں انسانی وقار کی حفاظت موت کے بعد بھی یکساں اہمیت رکھتی ہے، خواہ وہ مسلمان ہو یا دشمن۔ چنانچہ، جیسا کہ جنیوا کنونشن اوّل (GC I) کے آرٹیکل 17 اور ICRC Customary Law Study کے قاعدہ 112 میں بھی درج ہے۔

اصول "الحرب خدعة" کی تاریخی و عصری وضاحت:

اسلامی تجارتی بین الاقوامی قوانین کے اصول و ضوابط

شفافیتِ معاہدات اور اسلامی کمرشل کوڈ کی بنیاد

ارشادِ باری تعالیٰ ہے" :يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ "۔[74] یہاں لفظ "عُقُود" مطلق آیا ہے جس میں کسی عقد کی تخصیص نہیں کی گئی۔ اس اطلاقی (Universal) حکم کا مطلب یہ ہے کہ یہ حکم نجی وعدوں (Promises) سے لے کر تجارتی معاہدات

[72] عن جابر بن عبد الله ، ان رسول الله صلى الله عليه وسلم: كان يجمع بين الرجلين والثلاثة من قتلى احد في ثوب واحد، ثم يقول:" ايهم اكثر اخذا للقرآن"، فإذا اشير له إلى احدهم قدمه في اللحد، وقال:" انا شهيد على هؤلاء، وامر بدفنهم في دمائهم، ولم يصل عليهم، ولم يغسلوا."(صحيح البخارى/الجنائز72 (1343)، 73 (1245)، 75 (1347)، 78 (1353)، المغازي 126 (4079)، سنن ابى داود/ الجنائز 31 (3138، 3139)، سنن الترمذى/الجنائز46 (1036)، سنن النسائى/الجنائز62 (1957)، (تحفة الأشراف: 2382) (صحيح)

[73] Rule 112. Whenever circumstances permit, and particularly after an engagement, each party to the conflict must, without delay, take all possible measures to search for, collect and evacuate the dead without adverse distinction.(First Geneva Convention, Article 15, first paragraph :Second Geneva Convention, Article 18, first paragraph :Fourth Geneva Convention, Article 16, second paragraph)

Jean-Marie Henckaerts and Louise Doswald-Beck (eds), Customary International Humanitarian Law, Vol. 1: Rules, Cambridge University Press, Cambridge, 2005, Rule 112, available at: https://ihl databases.icrc.org/customary-ihl/eng/docs/v1_rul_rule112.

[74] (المائدہ:1)

(Commercial Contracts)اور ریاستی و بین الاقوامی معاہدات (Political and International Treaties) تک سب کو شامل ہے۔ فقہی اعتبار سے پر علمانے اس آیت کو ایک جامع قاعدہ (Universal Legal Maxim) قرار دیا ہے جس کے تحت بیع، سلم، استصناع جیسے تجارتی معاہدات بھی شامل ہیں اور صلح و امن جیسے بین الاقوامی معاہدات بھی۔ اس طرح قرآن نے معاہدات کی شفافیت اور تکمیل کو ہر سطح پر لازم قرار دیا اور ایک Universal Contractual Ethicsیعنی "عالمی معاہداتی اخلاقیات" فراہم کی ہے۔

سیرتِ نبوی ﷺ اور بین الاقوامی تجارتی تعلقات

سیرت نبوی ﷺ میں ہمیں کئی امثلہ ملتی ہیں جہاں آپ نے براہِ راست بین الاقوامی تجارتی تعلقات قائم کیے۔ بعثت سے قبل شام (Syria)اور یمن کے تجارتی سفر، بین الاقوامی تجارتی تعلقات کی اولین مثالیں ہیں جن میں آپ ﷺ نے اہل روم اور اہل یمن کے تاجروں کے ساتھ لین دین کیا۔ بعد از بعثت ریاستِ مدینہ میں بھی یہ اصول برقرار رہا۔ مثال کے طور پر میثاقِ مدینہ (622ء) میں قبائل یہود کو نہ صرف مذہبی حریت دی گئی بلکہ ان کے تجارتی حقوق کا بھی دفاع کیا گیا۔ اسی طرح صلح نامہ حدیبیہ (628ء) کے بعد مسلمانوں کو مکہ اور اطراف کی منڈیوں میں تجارت کی کھلی اجازت ملی، جو شقیں لکھی گئیں ان میں تجارت کی روک تھام پر سخت حکم نہیں لگایا گیا تھا جو ایک بین الاقوامی اقتصادی breakthrough تھا۔ متذکرہ بالا تاریخ اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے بین الاقوامی تجارت میں "شفافیت (Transparency) "اور "رضامندی (Mutual Consent) "کو بنیادی اصول کے طور پر نافذ کیا۔

متذکرہ بالا نصوص کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ (WTO) "World Trade Organization" اور "Islamic Commercial Code" (ICC) جیسے اداروں کے ساتھ تجارتی قوانین کے مترادف ہیں۔ WTO کا موجودہ قانونی ڈھانچہ سرمایہ دارانہ اصولوں پر مبنی ہے جہاں profit maximization(زیادہ سے زیادہ منافع) بنیادی ہدف ہے اور اخلاقی اصولی پہلو ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس اسلامی اصولوں کی بنیاد Maqasid al-Shariah(مقاصدِ شریعت) ہیں جن میں عدل (Justice)، فلاح(Welfare) ، شفافیت (Transparency) اور امن (Peace) بنیادی اقدار ہیں۔ ایک "Islamic Commercial Code"(اسلامی تجارتی ضابطہ) اس قرآنی اصول کے تحت تشکیل دیا جا سکتا ہے جس میں ہر معاہدہ لازمی طور پر تحریری ,(Written) گواہی کے ساتھ ,(Witnessed) اور عوامی شفافیت کے ساتھ (Publicly Transparent) ہو۔ مزید برآں، ICCمیں ایسے اخلاقی ریگولیشنز (Ethical Regulations) شامل کیے جا سکتے ہیں جن کے تحت حرام تجارت (Prohibited Trade) جیسے شراب، سودی سرمایہ یا استحصالی اسلحہ کم از کم اسلامی ممالک سے کی جانے والی تجارت کے زمرے میں ممنوع قرار پائیں۔ اس طرح اسلامی اصول، WTO کے مقابلے میں زیادہ متوازن، انسانی فلاح پر مبنی اور اخلاقی طور پر پائیدار رہنما خطوط فراہم کریں گے۔

نتیجتاً ہم کہ سکتے ہیں کہ شفافیتِ معاہدات کا اصول صرف ذاتی لین دین کا اصول نہیں بلکہ یہ اصول ریاستی اور بین الاقوامی تعلقات کی بھی بنیاد ہے۔ اگر اس اصول کو عصری اطلاقات کے تناظر میں دیکھا جائے **OIC (Organization of Islamic Cooperation)** کے تحت ایک ایسا ادارہ بناسکتے ہیں جسے ہم "Islamic Commercial Code Council" کہہ سکتے ہیں۔ یہ ادارہ اسی طرح کام کرے گا جیسے آج (World Trade Organization) WTO عالمی تجارت کو ریگولیٹ کرتا ہے، مگر فرق یہ ہوگا کہ اسلامی ادارے کے اصول شرع کے تابع ہوں گے۔ اس کا مقصد یہ ہوگا کہ مسلم ممالک کے درمیان تجارت ایک ایسے نظام کے تحت ہو جو غیر سودی(Non-Riba) ،شفاف (Transparent) اور تحریری و منظم (Codified) ہو۔ اس طرح مسلمان دنیا اپنے لئے ایک مضبوط، منصفانہ اور پائیدار تجارتی ڈھانچہ تیار کرے گی اور پھر اسے عالمی سطح پر بھی ایک متبادل ماڈل کے طور پر پیش کر سکے گی۔ یوں قرآن کا اصول "شفافیتِ معاہدات" صرف ایک مذہبی اخلاقی اصول نہیں رہے گا بلکہ آج کے عالمی تجارتی نظام کے لئے ایک عملی اور رہنما اصول بن سکتا ہے جو دنیا کی معیشت کو زیادہ منصفانہ اور پائیدار بنادے گا۔

غیر سودی کرنسی اور اسلامی مالیاتی بلاک

قرآن نے تجارت کو حلال اور سود (ربا) کو حرام قرار دے کر[75] بین الاقوامی مالیاتی اصولوں کا خط وضع کر دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے دور میں سونے اور چاندی کو مبادلہ کا معیار بنایا لیکن سود کو ہر سطح پر ممنوع قرار دیا، تاکہ تجارت حقیقی قدر (Real Value) پر قائم ہو اور مالیاتی نظام استحصالِ زر کا شکار نہ بنے۔ تاریخِ اسلام میں عہدِ عباسیہ کے دینار اور درہم اس اصول کی عملی مثال تھے، جنہوں نے صدیوں تک ایک مستحکم بین الاقوامی کرنسی کا کردار ادا کیا اور اسلامی دنیا کو معاشی خودمختاری بخشی۔ آج کے دور میں جب عالمی معیشت سودی نظام اور فیاٹ کرنسی – (Fiat Currency) بغیر حقیقی پشتوانے کے کاغذی پیسہ پر چل رہی ہے تو اس کا نتیجہ مسلسل معاشی بحران، افراطِ زر اور عالمی عدم استحکام کی صورت میں پیش آرہا ہے۔ اس تناظر میں اسلامی اصولِ تجارت یہ رہنمائی فراہم کرتے ہیں کہ مسلم ممالک باہمی سطح پر ایک Gold-backed Digital Currency یا "Islamic Trade Dinar" تشکیل دیں، جو بین الاقوامی مالیاتی فنڈ (IMF – International Monetary Fund) کے **SDRs**

[75] (البقرہ:275)

(Special Drawing Rights) کا متبادل ہو۔ اس سے نہ صرف آرگنائزیشن آف اسلامک کورپوریشن OIC ممالک ایک غیر سودی مالیاتی بلاک (Non-Riba Financial Bloc) قائم کر سکتے ہیں بلکہ یہ کرنسی عالمی سطح پر بھی ایک Ethical Currency Model کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے۔ فائدہ یہ ہو گا کہ بین الاقوامی تجارت میں مسلم دنیا کو سودی نظام پر انحصار سے آزاد کرے، Mutual Trade کو زیادہ شفاف اور پائیدار بنائے، اور ایک ایسا متبادل فراہم کرے جو حقیقی قدر (Gold/Assets-backed) پر مبنی ہو۔ یوں قرآن و سنت کے یہ اصول صرف تاریخی رہنمائی نہیں بلکہ آج کے عالمی تجارتی ڈھانچے کے لئے ایک قابلِ عمل حل (Viable Alternative) بھی فراہم کرتے ہیں۔ تجارت کی سب سے نمایاں رکاوٹ **محصولات (Tariffs)** ہیں، [76] یعنی وہ ٹیکس جو سرحد پر درآمدی اشیاء پر عائد کیا جاتا ہے۔ اسلام میں مختلف اقسام کے ٹیکس تسلیم کیے گئے ہیں جو بنیادی طور پر چار بڑے حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں:

محاربی ممالک سے اقتصادی مقاطعہ کا اصول:

ایسے ملک یا اداروں کے ساتھ تجارتی و اقتصادی تعلق قائم کرنا جائز نہیں جو مسلمانوں کے خلاف حالتِ جنگ میں ہوں اور جن کے ساتھ تعلق سے اس کی جنگی یا سیاسی قوت میں اضافہ ہو۔ قرآنِ کریم کا واضح حکم ہے" :وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ " [77]، ظلم و زیادتی میں تعاون نہ کرو۔ کلاسیکل عہد کے فقہائے کرام نے اسی بنیاد پر یہ اصول طے کیا کہ عام اشیاء کی تجارت تو مباح ہے، لیکن اگر دشمن محارب کو اس سے تقویت ملتی ہو تو وہ بھی ناجائز ہو جاتی ہے۔

ثُمَّ هٰذَا الْحُكْمُ إِذَا لَمْ يُحَاصِرُوا مِنْ حُصُونِهِمْ، فَأَمَّا إِذَا حَاصَرُوا حِصْنًا مِنْ حُصُونِهِمْ فَلَا يَنْبَغِي لَهُمْ أَنْ يَبِيعُوا مِنْ أَهْلِ الْحِصْنِ طَعَامًا وَلَا شَرَابًا وَلَا شَيْئًا يُقَوِّيهِمْ عَلَى الْمَقَامِ؛ لِأَنَّهُمْ إِنَّمَا حَاصَرُوهُمْ لِيَنْفَدَ طَعَامُهُمْ وَشَرَابُهُمْ حَتَّى يُعْطُوا بِأَيْدِيهِمْ وَيَخْرُجُوا عَلَى حُكْمِ اللهِ تَعَالَى، فَفِي بَيْعِ الطَّعَامِ وَغَيْرِهِ مِنْهُمْ اكْتِسَابُ سَبَبِ تَقْوِيَتِهِمْ عَلَى الْمَقَامِ فِي حِصْنِهِمْ، بِخِلَافِ مَا سَبَقَ، فَإِنَّ أَهْلَ الْحَرْبِ فِي دَارِهِمْ يَتَمَكَّنُونَ مِنِ اكْتِسَابِ مَا يَتَقَوَّوْنَ بِهِ عَلَى الْمَقَامِ، لَا بِطَرِيقِ الشِّرَاءِ مِنَ الْمُسْلِمِينَ، فَأَمَّا أَهْلُ الْحِصْنِ لَا يَتَمَكَّنُونَ مِنْ ذٰلِكَ بَعْدَ مَا أَحَاطَ الْمُسْلِمُونَ بِهِمْ، فَلَا يَحِلُّ لِأَحَدٍ مِنَ الْمُسْلِمِينَ أَنْ يَبِيعَهُمْ شَيْئًا مِنْ ذٰلِكَ، وَمَنْ فَعَلَهُ فَعُلِمَ بِهِ الْإِمَامُ أَدَّبَهُ عَلَى ذٰلِكَ لِارْتِكَابِهِ مَا لَا يَحِلُّ[78].

---

[76] ابن خلدون لکھتے ہیں کہ "محصولات" یا "مکس" (عربی میں: مُکس) دراصل رسم یا عادت سے پیدا ہوتے ہیں۔ ریاست ابتدا میں ہلکے درجے کے محصولات لگاتی ہے، مگر رفتہ رفتہ ان میں اضافہ کرتی جاتی ہے یہاں تک کہ یہ انصاف کی حد سے تجاوز کر جاتے ہیں اور مستقل روایت یا رواج کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ (ابن خلدون، المقدمۃ، جلد دوم، ص 668-669، 1957)۔ ابن خلدون نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف المقدمۃ سن 1377ء میں تحریر کی، جو ان کی بڑی کتاب کتاب العبر کے سات جلدوں پر مشتمل مجموعے کا پہلا حصہ ہے۔ اس کتاب میں ابن خلدون نے نہ صرف ماقبل اسلام دنیا کے حالات بیان کیے ہیں بلکہ عربوں اور مشرقی مسلم دنیا کی تاریخ بھی درج کی ہے۔ مزید برآں انہوں نے مغربی اسلامی دنیا (اندلس و مغرب) کی تاریخ کو بھی اپنے تجزیے کا حصہ بنایا ہے۔

[77] (المائدہ:2)

[78] شرح السير الكبير، باب هدية أهل الحرب:1/1242)

اور یہ حکم اس صورت میں ہے جب وہ (مسلم) دشمن کے قلعوں / حصون کو محاصرہ نہ کریں؛ لیکن اگر انہوں نے ان کے کسی قلعہ کو گھیر لیا (محاصرہ کیا) تو ان کے لیے مناسب نہیں کہ وہ اُس قلعہ کے باشندوں کو خوراک، مشروب یا وہ کچھ verkaufen دیں جو انہیں وہاں ٹھہرنے کی طاقت دے۔ کیونکہ ان کا محاصرہ اسی لیے ہے کہ ان کے کھانے پینے کو نفاد تک پہنچا دیں تا کہ ہاتھوں سے دے کر یا حکم کے مطابق باہر نکل آئیں۔ اس لیے خوراک وغیرہ کی فروخت کے ذریعہ اُن کی ٹھہرانے کی قوت بڑھا دینا باعثِ ممانعت ہے۔ یہ صورت پچھلی صورت سے مختلف ہے؛ کیونکہ جنگ کے عام لوگ (یعنی وہ جو دارِ حرب میں ہیں) اپنے علاقے میں وہ سامان حاصل کر سکتے ہیں جو انہیں مقام پر مضبوط رکھتا ہے، اور وہ اسے مسلمانوں سے خرید کر نہیں کرتے۔ لیکن قلعے کے باشندے محاصرہ کے بعد اس طرح کے وسائل تک رسائی نہیں پا سکتے، لہٰذا کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ انہیں ایسے اشیاء فروخت کرے۔ اور جو شخص ایسا کرے اور امام کو اس کا علم ہو تو امام اسے اس جرم (یعنی وہ کام جو جائز نہیں) پر ادب ٹھہرا دے۔

عہدِ رسالت مآب صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اور دورِ خلافتِ راشدہ میں بھی یہی اصول کارفرما رہا۔ نبی اکرم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے اہلِ مکہ کے ساتھ عام اشیاء کی خرید و فروخت کو بعض حالات میں اجازت دی، لیکن اسلحہ یا جنگی آلات بیچنے سے سختی سے روکا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے بھی روم و فارس کے ساتھ تعلقات میں یہی معیار اپنایا کہ اگر مسلمانوں کو نقصان کا اندیشہ ہو تو تجارتی ربط منقطع کر دیا جائے۔ اسی اصول کے تحت عصرِ حاضر میں اسرائیل کے ساتھ معاشی بائیکاٹ محض ایمانی غیرت نہیں بلکہ ہمارا شرعی فریضہ ہے۔ کیونکہ تجارتی تعلقات براہِ راست اس کی جنگی طاقت کو بڑھاتے ہیں جو مظلوم فلسطینیوں کے قتل و غارت میں استعمال ہو رہی ہے۔ لہٰذا اسلامی بین الاقوامی تجارتی قانون کا تقاضا ہے کہ مسلم ممالک اپنی اقتصادی پالیسیوں میں فقہی و اخلاقی پہلوؤں کو شامل کریں، تا کہ تجارت منافع اندوزی کے بجائے عدل، امن اور مظلوموں کی حمایت پر مبنی ہو۔

غیر معقول محصولات کا سدِ باب:

اسلامی اصولِ تجارت میں عدل، شفافیت اور منصفانہ محصولات بنیادی رہنما اصول ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے " :وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ[79] "یعنی ہر تجارتی لین دین میں انصاف کے ساتھ پیمانہ قائم کرو۔ نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ناجائز ٹیکس (مکوس) کو سختی سے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا" لا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ صَاحِبُ مَكْسٍ[80]۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام نے تجارتی سرگرمیوں پر غیر منصفانہ محصولات کو ظلم کے مترادف قرار دیا۔ تاہم مطالعہ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا عمر بن خطابؓ نے بین الاقوامی سطح پر تجارت کے نظام کی بحالی کے لئے ایک باقاعدہ کسٹم ریونیو سسٹم متعارف کروایا، لیکن اس کی بنیاد صرف معاملہ بالمثل تھی یعنی جتنا محصول غیر مسلم ریاستیں مسلمانوں پر لگاتی تھیں، اتنا ہی ان سے لیا جاتا تھا[81]۔ رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ناجائز محصولات خصوصاً

---

[79] الرحمن:9

[80] سنن ابي داود،كتاب الخراج والفيء والإمارة ،حديث: 2937

[81] بلاذری، احمد بن یحییٰ بن جابر، امام ابی العباس، فتوح البلدان، موسستہ المعارف، بیروت، 1403ھ، ص:270

کسٹمز ڈیوٹی کے نفاذ کی سخت الفاظ میں مذمت کی۔ ایک حدیث میں فرمایا" :جو شخص ناجائز ٹیکس (صاحبِ مکس) وصول کرے گا، وہ جنت میں داخل نہ ہو گا"۔[82] یہ حدیث نہ صرف غیر شرعی محصولات پر پابندی لگاتی ہے بلکہ اس میں واضح کیا گیا ہے کہ شہری ہو یا غیر ملکی تاجر، کسی پر بھی اضافی ٹیکس لگانا ممنوع ہے۔ یہ اصول صرف نظری نہیں بلکہ عملی طور پر بھی نافذ تھا۔ مدینہ منورہ میں تقریباً ستر برس تک تجارت پر کوئی کسٹمز ڈیوٹی عائد نہیں کی گئی۔ بعد ازاں حضرت امیر معاویہؓ کے دور میں محصولات کا نفاذ شروع ہوا، لیکن حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے عہدِ خلافت میں انہیں ختم کر دیا گیا۔ تاہم جب یہ اطلاع ملی کہ دوسرے ممالک مسلمانوں کی اشیاء پر محصولات لگا رہے ہیں تو حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے عشر (10٪ ٹیکس) درآمدی اشیاء پر عائد کیا۔[83] یوں ابتدائی اسلامی ریاست میں محصولات کی پالیسی اصولِ باہمی جواب دہی (Reciprocity) پر قائم تھی، یعنی اگر دوسرے ممالک مسلمانوں کی تجارت پر محصولات لگائیں تو مسلمان بھی اسی کے مطابق محصولات عائد کر سکتے ہیں۔ مدینہ منورہ سے باہر اسلامی ریاست کے دائرہ کار کے پھیلاؤ کے بعد مسلمانوں کے ہاتھ میں وسیع و عریض زمینیں آئیں۔ نبی اکرم ﷺ اور آپ کے صحابہؓ نے انفرادی کاروباری صلاحیت اور آزاد تجارت کے اصول کو تسلیم کیا اور بنجر زمین کو کارآمد بنانے کی بھرپور ترغیب دی۔[84]

اسلام میں ملکیتِ فردی کو بنیادی حرمت حاصل ہے،[85] البتہ اس پر بعض حدود بھی عائد ہیں، یعنی دوسروں کے حقوق اور اجتماعی مفاد کی پاسداری لازمی ہے۔ اس بنیاد پر بعض ماہرین درست طور پر کہتے ہیں کہ اسلامی معیشت ملے جلے نظامِ ملکیت پر قائم ہے۔ چونکہ تمام قدرتی وسائل کا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہے،[86] اس لیے اسلامی ریاست کو حق حاصل ہے کہ وہ انفال مثلاً زمین، پانی اور معدنیات پر کنٹرول رکھے۔ یوں اسلامی معاشی ڈھانچہ دوہری ملکیت (Dual Ownership) کے اصول پر قائم ہے: نجی ملکیت اپنی جگہ محفوظ ہے، مگر اس کا مالک دراصل اللہ تعالیٰ کا نائب اور امین ہوتا ہے، جو حقیقی مالک ہے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ اسلامی قانون میں فکری ملکیت (Intellectual Property) کے تحفظ کے بارے میں خاموشی پائی جاتی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ خیالات کی نوعیت مادی اشیاء کی طرح محسوس اور قابلِ قبضہ نہیں ہوتی۔ اس بنا پر اسلامی قانون مطلق معنوں میں فکری ملکیت کو قانونی حق تسلیم نہیں کرتا؛ البتہ ریاست اپنی صوابدید پر اسے احترام دے سکتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی قانون مادی ملکیت کو بنیادی اہمیت دیتا ہے اور غیر

---

82 سلیمان بن اشعث، سنن ابی داود،

83 تیسری سالانہ علمی کانفرنس، اسلامی معاشی نظام: فکر اور عمل کے درمیان (1983)، ص436۔ قرآن مجید کی آیت 2:193 اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ اگر مسلمانوں پر کسی قسم کا جارحیت یا ظلم کیا جائے تو ویسا ہی بدلہ دیا جا سکتا ہے۔ بعض قدیم کتب میں "عُشور (Ushur)" اور "مکس (Maks)" کو ایک ہی مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے، تاہم "مکس" زیادہ واضح طور پر "کسٹمز ڈیوٹی" یا "محصولِ تجارتی" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ "عُشور" سے مراد وہ عشر یا عشرہ ہے جو عوامی بہبود کے لیے لیا جاتا ہے، اور اسے اکثر زکاۃ اور صدقہ کے مفہوم میں بھی برتا گیا ہے۔ (ایچ۔ اے۔ آر۔ گیب اور جے۔ ایچ۔ کریمرز، کنسائز انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، ص317 (چوتھا ایڈیشن، 2001)۔)

84 عَنْ سَعِيدِ بْنِ زَيْدٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: مَنْ أَحْيَا أَرْضًا مَيْتَةً فَهِيَ لَهُ، وَلَيْسَ لِعِرْقٍ ظَالِمٍ حَقٌّ"

85 البقرة 2:188 (وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ

86 آل عمران-3:179 (وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ يَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ)

مادی ملکیت کو ثانوی درجہ عطا کرتا ہے۔[87] اس طرح اسلامی اصول میں کسٹم ڈیوٹی کا مقصد بین الممالک تجارتی سرگرمیوں کا فروغ تھا، نہ کہ عوام پر مالیاتی بوجھ ڈالنا۔ حالیہ دنوں میں ترقی پزیر اسلامی ممالک تجارتی سطح پر شدید مشکلات سے دوچار ہیں، کیونکہ بعض ریاستوں میں کسٹم ڈیوٹی کا تناسب اصل راس المال کے 50 فیصد تک جا پہنچتا ہے ۔[88] اس غیر متوازن نظام نے صنعتی ڈھانچے کو کمزور کیا اور کاروباری لاگت میں غیر معمولی اضافہ کیا، جس کے باعث مسلم ممالک عالمی تجارتی دوڑ میں پیچھے رہ گئے۔ بین الاقوامی سطح پر دنیائے اسلام کی تجارتی سرگرمیوں کی ترقی میں (World Trade Organization (WTO کے معاہدات حائل ہیں۔ ان میں:

- General Agreement on Tariffs and Trade (GATT, 1994)
- Agreement on Subsidies and Countervailing Measures (SCM Agreement)
- Agreement on Trade-Related Aspects of Intellectual Property Rights (TRIPS)
- Agreement on Agriculture (AoA)

متذکرہ بالا معاہدات ترقی پذیر اسلامی ممالک کی برآمدات پر رکاوٹ بنتے ہیں مثلاً TRIPS معاہدہ مقامی صنعتوں کو پیٹنٹ قوانین کے تحت دباؤ میں لاتا ہے جبکہ Agreement on Agriculture کے تحت زراعتی سبسڈیز پر پابندی عائد کی گئی، جس نے مسلم دنیا کے کسانوں کو عالمی مارکیٹ میں غیر مسابقتی بنا دیا۔[89] البتہ اسلامی نقطۂ نظر چند تجاویز براہ اصلاح پیش ہیں:

1. اسلامی ممالک او آئی سی (OIC) کے پلیٹ فارم پر مشترکہ تجارتی بلاک تشکیل دیں تاکہ collective bargaining کے ذریعے WTO قوانین میں نرمی حاصل کی جاسکے۔
2. کسٹم ڈیوٹیز کو اصل راس المال کے تناسب سے کم کیا جائے تاکہ سرمایہ کاروں اور صنعتکاروں کو زیادہ سے زیادہ منافع ملے۔
3. قرآن مجید کے اصول "تِجَارَۃً عَن تَرَاضٍ[90] " کی روشنی میں آزادانہ اور منصفانہ تجارت کو فروغ دیا جائے۔
4. نبوی تجارتی احکامات کے مطابق ناجائز ٹیکسز کا خاتمہ کیا جائے اور صرف وہ محصولات برقرار رہیں جو ریاستی عدل و مصالح کے تحت ہوں۔ یہ اقدامات نہ صرف اسلامی ممالک کی تجارتی زبوں حالی کو ختم کریں گے بلکہ انہیں بین الاقوامی تجارتی نظام میں پنپنے کا خوب موقع دیں گے ۔

[87] D. Jamar, The Protection of Intellectual Property Under Islamic Law, 21 CAP. U. L. REV 1079, 1082, 1093 (1992)

[88] Giroud, Axèle. "World Investment Report 2023: Investing in sustainable energy for all: United Nations Conference on Trade and Development, Geneva and New York, 2023, 205 pp." (2024): 128-131.

[89] (Hoekman & Kostecki, The Political Economy of the World Trading System, Oxford University Press, 2009)۔

[90] النساء:29

اول زکوٰۃ : یہ ایک لازمی مذہبی ٹیکس ہے جو ہر سال ایک مقررہ تناسب کے ساتھ مخصوص مال و دولت پر فرض ہوتا ہے، اور اس کا مقصد غرباء و مساکین کی مدد ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں اس کی صراحت موجود ہے۔[91]

دوم صدقہ: یہ ایک رضاکارانہ ٹیکس ہے، جسے ہر مسلمان اپنی مرضی اور حیثیت کے مطابق ادا کرتا ہے اور یہ مستحقین کے فائدے کے لیے ہوتا ہے۔[92]

سوم غنیمت: جنگ کے نتیجے میں حاصل ہونے والے مال میں سے اسلامی حکومت کا مقررہ حصہ۔ البتہ جدید زمانے میں، جب جنگیں کم ہو چکی ہیں، یہ ذریعہ عملاً غیر مؤثر ہے۔

چہارم: جزیہ –یہ وہ ٹیکس ہے جو غیر مسلم شہریوں پر ان کی جان و مال کے تحفظ کے عوض عائد کیا جاتا تھا۔

ان بنیادی مذہبی ذمہ داریوں کے علاوہ، ابتدائی اسلامی ریاست میں محصولات کی کوئی اور مستقل شکل نہیں پائی جاتی تھی۔

یہ سوال اپنی جگہ اہم ہے کہ اگر صرف زکوٰۃ، صدقہ، غنیمت اور جزیہ ہی محصولات تھے تو بعد میں جب اسلامی ریاست کا دائرہ وسیع ہوا تو اس کے اخراجات کس طرح پورے کیے جاتے تھے؟ اس کا جواب حدیثِ نبویؐ میں موجود ہے کہ

---

91 سورۃ التوبۃ: فَإِذَا انسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَإِن تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ
فَإِن تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَإِخْوَانُكُمْ فِي الدِّينِ ۗ وَنُفَصِّلُ الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ
إِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللَّهِ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَلَمْ يَخْشَ إِلَّا اللَّهَ ۖ فَعَسَىٰ أُولَٰئِكَ أَن يَكُونُوا مِنَ الْمُهْتَدِينَ
إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ

91 **سورۃ البقرۃ** 2:263 قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّن صَدَقَةٍ يَتْبَعُهَا أَذًى وَاللَّهُ غَنِيٌّ حَلِيمٌ۔
2:264 يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُم بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ كَالَّذِي يُنفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۖ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَأَصَابَهُ وَابِلٌ فَتَرَكَهُ صَلْدًا ۖ لَّا يَقْدِرُونَ عَلَىٰ شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوا ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ
2:271 إِن تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۖ وَإِن تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَيُكَفِّرُ عَنكُم مِّن سَيِّئَاتِكُمْ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ
2:280 وَإِن كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ ۚ وَأَن تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ

"عن فاطمة بنت قيس، قالت: سالت او سئل النبي صلى الله عليه وسلم عن الزكاة، فقال: "إن في المال لحقا سوى الزكاة "، ثم تلا هذه الآية التي في البقرة ليس البر ان تولوا وجوهكم سورة البقرة آية 177 الآية[93].

تمہارے مالوں میں زکوۃ کے علاوہ بھی حقوق ہیں"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست ضرورت کے وقت مزید ٹیکس عائد کر سکتی ہے، مگر یہ نظام انصاف، سہولت اور سادگی کے اصولوں پر قائم ہونا چاہیے۔

قیمتوں کے تعین کے حوالے سے اسلام کا اصول یہ ہے کہ یہ کام صرف اور صرف بازار کی قوتوں یعنی طلب اور رسد (Supply and Demand) کے مطابق ہونا چاہیے۔ اشیاء کی گرانی اور سستی اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، اس لیے قیمتیں طے کرنا انسانی اختیار میں نہیں ہونا چاہیے بلکہ خدائی نظام پر چھوڑ دینا چاہیے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ جب مدینہ میں قیمتیں غیر معمولی طور پر بڑھ گئیں تو لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے مداخلت کی درخواست کی، لیکن آپ ﷺ نے انکار فرمایا۔ البتہ یہ حکم مطلق نہ تھا۔ اسلامی ماخذات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض مواقع پر رسول اللہ ﷺ نے بطور سربراہِ ریاست قیمتوں کے نظام میں مداخلت بھی فرمائی۔ مثلاً ایک واقعے میں یہ بات سامنے آئی کہ کچھ لوگ بازار پہنچنے سے پہلے قافلوں سے سامان خرید لیتے اور پھر بازار میں اسے زیادہ قیمت پر فروخت کرتے۔ آپ ﷺ نے اس عمل کو دھوکہ دہی اور ناجائز تجارتی طریقہ قرار دیا اور اس کی ممانعت فرمائی۔[94] اس طرح واضح ہوتا ہے کہ اسلام میں منڈی کی قوتوں کو آزادی دی جاتی ہے، مگر ان پر اخلاقی اور قانونی نگرانی بھی رکھی جاتی ہے تاکہ استحصال اور ناجائز منافع خوری کا راستہ روکا جا سکے۔

اصولِ آزادی تجارت:

اسلام معاشی زندگی میں آزادیِ تجارت کے اصول کو تسلیم کرتا ہے، لیکن یہ آزادی مطلق نہیں ہے۔ اس پر اخلاقی اور دینی حدود عائد ہیں تاکہ تجارت میں عدل، انصاف اور دیانت قائم رہے اور انسانی معاشرہ معاشی بگاڑ یا استحصال سے محفوظ رہ سکے۔ سب سے پہلی حد حرام اشیاء کی ممانعت ہے۔ اسلام میں وہ اشیاء جنہیں قرآن وسنت نے ناجائز قرار دیا ہے، مثلاً شراب، سور کا گوشت یا جوا وغیرہ، ان کی خرید وفروخت ممنوع ہے۔[95] اس سے یہ اصول واضح ہوتا ہے کہ تجارتی اشیاء کا ماخذ اور ان کی نوعیت پاکیزہ، درست اور انسانی فلاح کے لیے غیر مضر ہونی چاہیے۔ دوسری بڑی حد سود (ربا) کی حرمت ہے۔[96] ربا کا مطلب ہے کسی بھی غیر منصفانہ فائدے یا ناجائز نفع کا حصول۔ اسلامی نظریۂ معیشت میں پیسہ محض ایک ذریعہ تبادلہ ہے، جس کے ذریعے اشیاء اور خدمات کی خرید وفروخت آسان بنائی جاتی ہے، نہ کہ خود سرمایہ کاری سے منافع کمانے کا ذریعہ۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام مقررہ شرحِ سود پر قرض دینے یا لینے کو ناجائز قرار دیتا ہے، کیونکہ اس میں بغیر محنت اور حقیقی خطرے کے محض سرمائے کے زور پر نفع کمایا جاتا ہے۔ اسلام اس کے بجائے سرمایہ کو کاروبار اور

---

[93] محمد بن عیسیٰ الترمذی، *سنن الترمذی، کتاب الزکاۃ*، حدیث: 659۔

[94] عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضي الله عنهما قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ:لَا تَلَقَّوْا الرُّكْبَانَ، وَلَا يَبِعْ بَعْضُكُمْ عَلَى بَيْعِ بَعْضٍ(محمد بن اسماعیل البخاری، الجامع الصحیح، کتاب البیوع، باب تلقي الرکبان، حدیث: 2165۔

[95] المائدہ 5:3(حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَأَنْ تَسْتَقْسِمُوا بِالْأَزْلَامِ ذَٰلِكُمْ فِسْقٌ..)

[96] البقرہ2:275(الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقُومُونَ إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ... وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا...)

پیداوار میں لگانے کی ترغیب دیتا ہے۔ ربا کے مسئلے پر بحث یہ بھی ہوتی رہی ہے کہ پیسے کی قدر صرف مقدار سے جانی جائے یا وقت کی قدر کو بھی اس میں شامل کیا جائے۔ اگر کوئی شخص کسی کو سو ڈالر تین ماہ کے لیے قرض دے، تو اسلامی اصول کے مطابق تین ماہ بعد اسے صرف سو ڈالر ہی واپس لینے کا حق ہے، خواہ کرنسی کی قدر کم ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے برعکس مغربی مالیاتی نظریات یہ کہتے ہیں کہ چونکہ قرض دینے والا شخص اپنا سرمایہ تین ماہ تک کسی اور فائدہ مند جگہ استعمال نہیں کر سکا، لہٰذا اسے کچھ اضافی رقم ملنی چاہیے۔ لیکن اسلام اس اضافی رقم کو ربا یعنی سود قرار دے کر ناجائز ٹھہراتا ہے۔[97]

ان حدود کے باوجود اسلام نے تجارت و معیشت کو روکنے کے بجائے متبادل طریقے فراہم کیے ہیں تاکہ مالی سرگرمیاں جاری رہیں اور عالمی سطح پر بھی لین دین ممکن ہو۔ ان میں سب سے اہم تین معاہدے درج ذیل ہیں:

1. مضاربہ (اعتماد پر مبنی سرمایہ کاری) : اس میں ایک فریق سرمایہ فراہم کرتا ہے (رب المال) اور دوسرا اپنی محنت و صلاحیت (مضارب) کے ذریعے کاروبار کرتا ہے۔ منافع پہلے سے طے شدہ شرح کے مطابق تقسیم ہوتا ہے جبکہ نقصان کی ذمہ داری صرف سرمایہ کار پر آتی ہے۔ یہی طریقہ آج اسلامی بینکنگ میں وسیع پیمانے پر استعمال ہو رہا ہے۔
2. مشارکہ (شراکت داری) : اس میں دونوں فریق سرمایہ لگاتے ہیں اور نفع و نقصان کو متناسب طور پر بانٹتے ہیں۔
3. مرابحہ (قیمت پلس منافع) : اس طریقے میں فروخت کنندہ خریدار کو کسی چیز کی اصل قیمت بتاتا ہے اور اس پر ایک طے شدہ منافع شامل کر کے بیچتا ہے۔ اس طرح سرمایہ کاری اور مالی تعاون سود کے بغیر ممکن ہو جاتا ہے۔

یوں اسلام نے ایک ایسا نظام فراہم کیا ہے جو تجارت اور سرمایہ کاری کو فروغ دیتا ہے، مگر ساتھ ہی عدل و انصاف اور اخلاقی اصولوں کو بھی یقینی بناتا ہے۔ اسلامی معیشت کی یہ خصوصیت اسے صرف ایک مالیاتی نظام نہیں بلکہ ایک اخلاقی و سماجی فریم ورک بھی بناتی ہے، جو فرد اور معاشرے دونوں کی فلاح کو سامنے رکھتا ہے۔

اسلامی قانون میں تجارت کی ایک اور بڑی حد غرر یعنی غیر یقینی یا بے جا قیاس و حدس پر مبنی معاملہ ہے۔ غرر سے مراد ایسے تجارتی یا مالی معاہدات ہیں جن میں چیز کی حقیقت یا انجام واضح نہ ہو۔ مثال کے طور پر ایسی مچھلی کی فروخت جو ابھی سمندر سے پکڑی ہی نہیں گئی، یا وہ

---

[97] ربا کی تعریف اور اس کے اثرات پر ایک متنوع لٹریچر موجود ہے۔ اس بحث کا بنیادی نکتہ یہ ہے کہ ربا کس چیز کو کہا جائے۔ بعض کلاسیکی مسلم فقہاء نے ربا کو وسیع مفہوم میں لیا ہے اور اسے ہر اس اضافے پر محمول کیا ہے جو بلا عوض حاصل ہو، خواہ وہ محض عددی اعتبار سے زرِ نقد میں اضافہ ہو، خواہ حقیقی قدر میں نہ ہو۔ دوسری طرف بعض معتدل فقہاء نے ربا کو محدود مفہوم میں لیا ہے اور اس سے مراد صرف وہ زیادتی لی ہے جو اصل مال پر حقیقی قدر سے زائد اور مضاعف صورت میں اس وقت عائد کی جاتی ہے جب مقروض مقررہ وقت پر ادائیگی نہ کر سکے۔ اس دوسرے نقطۂ نظر کے مطابق صرف ضرورت سے زیادہ اور مضاعف سود ممنوع ہے، محض ہر قسم کے اضافے کو ربا قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مسلم دنیا میں ربا کی حرمت اور اس کے نفاذ میں مختلف تعبیرات پائی جاتی ہیں۔ پہلے نقطۂ نظر کے عملی مظاہر ایران، پاکستان، سعودی عرب اور سوڈان میں ملتے ہیں۔

روزانہ کے تجارتی سودے (Day Trading) جن میں محض قیاس آرائی کی بنیاد پر خرید و فروخت کی جاتی ہے۔ اسی طرح زندگی کی انشورنس کو بھی بعض علماء غرر کی مثال قرار دیتے ہیں، کیونکہ یہ دراصل انسان کی زندگی پر ایک طرح کا جوا ہے۔ اسلام کے نزدیک زندگی اور موت کا مکمل اختیار اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، اور اس نے ازل سے ہی ہر فرد کی تقدیر متعین کر رکھی ہے۔

البتہ بعض معاصر اہلِ علم یہ نکتہ اٹھاتے ہیں کہ جدید زندگی پیچیدہ اور غیر یقینی ہے، اس لیے خاندان کی کفالت کے لیے انشورنس کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔ لیکن اسلامی نظام میں اس کا متبادل پہلے ہی موجود ہے، جیسے قانونِ وراثت، زکوٰۃ اور بیت المال یا سوشل سکیورٹی کا نظام۔ مزید یہ کہ آج کے دور میں انشورنس کا ایک اسلامی ماڈل تکافل کے نام سے رائج ہے، جو باہمی تعاون اور اجتماعی کفالت کے اصول پر مبنی ہے اور شریعت کے مطابق سمجھا جاتا ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ اگر غرر کے اصول کو نہایت سختی کے ساتھ لیا جائے تو معاشی زندگی تقریباً ناممکن ہو جائے، کیونکہ ہر معاملے میں کسی نہ کسی درجے کا شک اور غیر یقینی ضرور شامل ہوتا ہے۔ اسی لیے اسلامی فقہ نے اس اصول کو اعتدال کے ساتھ برتا ہے اور یہ وضاحت کی ہے کہ وہی غرر ناجائز ہے جو ضرورت سے زیادہ اور حد سے بڑھا ہوا ہو۔ یوں اسلامی قانون نے معاشی سرگرمیوں کو روکنے کے بجائے ان کے لیے ایک توازن اور معیار قائم کیا ہے تاکہ تجارت منصفانہ، شفاف اور استحصال سے پاک رہے۔

مقاصد شریعت اور تجارتی سرگرمیوں کا ہم آہنگ ہونا:

اسلامی اصولِ تجارت میں ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ ہر قسم کا معاہدہ (Contract) صرف فریقین کی وقتی منفعت پر محدود نہیں ہوگا بلکہ وہ مقاصدِ شریعت کے ساتھ ہم آہنگ ہونا چاہئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا" انَّ دِمَاءَكُمْ وَأَمْوَالَكُمْ وَأَعْرَاضَكُمْ عَلَيْكُمْ حَرَامٌ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هَذَا، فِي بَلَدِكُمْ هَذَا، فِي شَهْرِكُمْ هَذَا'' "تمہارا خون، تمہارا مال اور تمہاری عزت ایک دوسرے پر اسی طرح حرام ہے جیسے تمہارے اس دن، اس مہینے اور اس شہر کی حرمت ہے۔[98] اسلامی معاہدات کا حقیقی مقصد انسانی جان، مال اور عزت کی حفاظت کو یقینی بنانا ہے۔ امام شاطبیؒ نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف الموافقات میں مقاصدِ شریعت کو پانچ بنیادی مقاصد میں تقسیم کیا: دین، جان، مال، عقل اور نسل / عزت کی حفاظت۔[99] اس بنیاد پر ہر وہ معاہدہ ناجائز ہے جو ان میں سے کسی مقصد کے منافی ہو، مثلاً سودی قرضے، دھوکہ دہی پر مبنی تجارتی معاہدے یا ایسے معاہدات جو انسان کی عزت و وقار کو پامال کرتے ہوں۔ جدید بین الاقوامی تجارت کے تناظر میں بھی یہ اصول قابلِ بیان ہے، کیونکہ عالمی تجارتی تنظیم (WTO) کے بعض معاہدات، جیسے Agreement on Agriculture اور Agreement on Trade-Related Aspects of Intellectual Property Rights (TRIPS)، ترقی پذیر اور اسلامی ممالک کی معیشت پر غیر معمولی اثرات مرتب کرتے ہیں، جس سے حفظ المال کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ اسی طرح

98 صحیح البخاری، کتاب الحج، حدیث: 1741

99 الشاطبی، الموافقات فی اصول الشریعۃ، دار المعرفۃ، بیروت (1966)، ج2، ص: 8-12

عالمی سطح پر مزدوروں کے اجرتی استحصال، ماحولیاتی تعفن جیسے مسائل براہِ راست حفظ النفس اور حفظ العقل کے اصولوں کے منافی ہیں۔[100]

اس پس منظر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی اصول"Conformity of Contracts with Maqāṣid al-Sharīʿah"

نہ صرف داخلی سطح پر تجارتی سرگرمیوں میں رہنما اصول ہے بلکہ بین الاقوامی سطح پر بھی ایک انسان دوست معاشی نظام قائم کرنے کے لیے صریح راہنمائی فراہم کرتا ہے۔

قبولیتِ نفع ونقصان:

اسلامی اصولِ تجارت الخراج بالضمان یعنی "منافع اسی کو جائز ہے جو خسارے کی ذمہ داری بھی اٹھائے"[1] ایک ایسا بنیادی قاعدہ ہے جو نہ صرف داخلی سطح پر بلکہ بین الاقوامی تجارت میں بھی عدل و توازن قائم کرنے کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کے ارشادات[2] اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ کوئی نفع اس وقت تک جائز نہیں جب تک اس کے ساتھ حقیقی قبضہ، ضمانت اور خطرے (risk) کی ذمہ داری موجود نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں بیع مالیس عندک یعنی ایسی چیز کی خرید و فروخت جو تاجر کے پاس موجود نہ ہو، ناجائز قرار دی گئی۔ اس اصول کی عقلی بنیاد یہ ہے کہ حقیقی تجارت صرف تب مستحکم اور عادلانہ ہو گی جب وہ حقیقی اثاثوں اور ذمہ داریوں پر قائم ہو، ورنہ محض قیاس آرائی (speculation) اور کاغذی سودے معاشی بحران کو جنم دیتے ہیں۔

جدید بین الاقوامی سطح پر دیکھیں تو یہی اصول ہمیں موجودہ تجارتی بحرانوں اور معاشی ناہمواریوں کا سبب بھی سمجھاتا ہے۔ عالمی سطح پر Derivatives، Futures Contractsاور Speculative Trading اکثر ایسے اموال پر ہوتے ہیں جو تاجر کے حقیقی قبضے یا ضمانت میں نہیں ہوتے، جس کی وجہ سے 2008 کا عالمی مالیاتی بحران سامنے آیا۔[3] اس کے برعکس اسلامی ماڈلز جیسے مضاربہ اور مشارکہ میں نفع و نقصان دونوں فریقوں پر تقسیم ہوتا ہے، جو عین اس نبوی اصول کا عملی مظہر ہیں۔

بین الاقوامی تجارت کے تناظر میں یہ اصول آج بھی نہایت اہمیت رکھتا ہے۔ جدید مالیاتی نظام میں futures contracts، derivativesاور speculative trading جیسی صورتیں بنیادی طور پر "بیع مالیس عندک" کے زمرے میں آتی ہیں، کیونکہ ان میں تاجر کے پاس حقیقی اثاثہ یا اس کی ذمہ داری موجود نہیں ہوتی۔[3] یہ طریقہ کار معاشی بحران پیدا کرتا ہے، جیسا کہ 2008 کے global financial crisis میں سامنے آیا۔ اس کے برعکس، اسلامی مالیاتی ماڈلز مثلاً مشارکہ اور مضاربہ ایسے ہی اصول پر کھڑے ہیں کہ نفع و نقصان دونوں شریک فریقوں پر تقسیم ہوں۔[4]

[100] Mohammad Hashim Kamali, *Maqasid al-Shariah Made Simple* (London: International Institute of Islamic Thought, 2008), 23–27.

تاہم، جدید دور میں عالمی تجارتی تنظیم World Trade Organization (WTO) کے قوانین اور معاہدات اسلامی اصولِ تجارت کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہیں۔ WTO کے Agreement on Agriculture (AoA) اور Agreement on Subsidies and Countervailing Measures (SCM Agreement)[5] نے ترقی پذیر ممالک، بالخصوص مسلم معیشتوں کے لئے غیر منصفانہ حالات پیدا کیے ہیں۔ ان معاہدات کے تحت ترقی یافتہ ممالک اپنی زرعی مصنوعات پر بھاری سبسڈی دیتے ہیں جبکہ کمزور معیشتوں کو بھاری custom duties اور tariff barriers کا سامنا ہوتا ہے، یہاں تک کہ بعض مواقع پر اصل سرمایہ کے 40–50 فیصد تک محصولات ادا کرنا پڑتے ہیں۔[6] نتیجتاً عالمی تجارت میں طاقتور ممالک نفع لیتے ہیں جبکہ نقصان کمزور ممالک پر منتقل کر دیا جاتا ہے، جو اصول الخراج بالضمان کی صریح خلاف ورزی ہے۔